ترنّم ریاض کے افسانوی مجموعے
ابابیلیں لَوٹ آئیں گی میں نِسائی نفسِیات

مقالہ برائے

ماسٹر آف فلاسفی

نگراں

ڈاکٹر راشد عزیز

مقالہ نگار

رُخسانہ بانو

شعبۂ اُردو

اسکول آف لینگوئجیز

سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر سرینگر

۲۰۱۸

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

Certificate

This dissertation titled Tarannum Reyaz Ke Afsanvi Majmuvay Ababeelain Laut Aaengi Mein Nisai-Nafsiyat submitted by Rukhsana Bano in partial fulfilment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu, is an independent and original piece of research work carried out under my supervision. This research work has not been submitted, in part or in full, to any university institute for any degree. The candidate has fulfilled all the statutory requirements for the submission of this dissertation.

Supervisor

Date: Dr Rashid Azeez

Declaration

I do hereby declare that this dissertation, Tarannum Reyaz Ke Afsanvi Majmuvay Ababeelain Laut Aaengi Mein Nisai-Nafsiyat submitted by me comprises the result of independent and original investigation that I have carried out. The material obtained from other sources and used in the dissertation has been duly acknowledged.

Place: Srinagar

Rukhsana Bano

Date:

حلف نامہ

میں بہ حلف اقرار کرتی ہوں کہ میں نے یہ مقالہ بعنوان ''ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے ابابیلیں لوٹ آئیں گی میں نِسائی نفسیات'' برائے حصول سند ماسٹر آف فلاسفی خود تحریر کیا ہے۔ میں نے اس مقالے میں تحقیق کے اصول وضوابط کو مدِ نظر رکھ کر سرقے سے اجتناب کیا ہے۔ اگر اس مقالے میں تحقیق کے حوالے سے کوئی کوتاہی پائی جاتی ہے تو اس صورت میں یونی ورسٹی میرے خلاف کوئی بھی کاروائی کرسکتی ہے۔

Research Scholar

Supervisor

Head of Department

Dean

Date

Place

فہرست ابواب

حرف آغاز

جموں وکشمیر ایک طرف فطری حسن کی بنیاد پر ایک الگ مقام رکھتا ہے تو دوسری طرف اس کے دامن میں اُردو نثری ادب کے کئی معتبر قلم کار کشمیر کی انفرادیت کو جلا بخش رہے ہیں۔ یہ اپنے قدرتی مناظر کی دلفریبی و دلکشی کی وجہ سے دنیا میں جہاں ارضی جنت کے نام سے معروف ہے وہیں ریاست جموں وکشمیر نے ادبی لحاظ سے بھی برصغیر ہندوپاک میں اہم مقام حاصل کیا ہے۔موجودہ افسانہ نگاروں میں کئی نامور کہانی کار ہیں جن کی افسانہ نگاری کو ادبی حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔اور آج بھی ان کا قلم خون جگر سے واردات قلب پیش کرنے میں مصروف ہے۔آج اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ریاست جموں وکشمیر میں اُردو افسانے کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ دیا جا رہا ہے۔اور دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں صنف افسانہ میں گراں قدر اضافہ کیا جا رہا ہے۔ دور حاضر میں صنف افسانہ کی خون جگر سے سنچائی کرنے والوں میں ترنم ریاض کا نام قابل ذکر ہے۔جنھوں نے اُردو افسانے کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

میرے مقالے کا عنوان ''ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' میں نسائی نفسیات'' ہے۔ اگر چہ ترنم ریاض نے عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑی سنجیدگی سے اُبھارا ہے پھر بھی کشمیر سے تعلق رکھنے والی خواتین قلم کاروں نے اپنے اپنے طور پر خواتین کے مسئلوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس مقالے میں پیش کردہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترنم ریاض نے کئی خواتین کے کرداروں کو اپنے مجموعے میں پیش کرکے سماجی مشکلوں اور پریشانیوں کا ازالہ کیا ہے۔ کیونکہ ترنم ریاض ریاست کی وہ مشاق ادیبہ ہے جس نے اُردو

افسانوی ادب کی روایتی اقدار کا خیال رکھتے ہوئے جدید تر رجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ سب سے بڑی اور مستحسن بات یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں، مرد اساس سماج میں عورت کی حیثیت واہمیت اور اس پر ہو رہے ظلم وستم کا برملا اظہار کیا ہے۔ ترنم ریاض ایک دردمند دل رکھنے والی حساس اور ذہین خاتون فکشن نگار ہیں۔ وہ جہاں ازدواجی زندگی پر لکھی گئی کہانیوں میں ایک ماہر نفسیات کی طرح باریک نکتوں پر فلسفیانہ بحث کرتی نظر آتی ہیں۔ وہیں طبقاتی کشمکش عصری انتشار اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کی کہانی لکھنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ مقالے کا پہلا باب اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں ترنم ریاض کی شخصیت اور فن کو مختصراً بیان کرنے میں کوزے میں دریا کے مانند ہو۔ ترنم ریاض کے فن پر روشنی ڈالنے کے بعد اُن کے مجموعے افسانہ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' کی انفرادیت واہمیت و موضوع بحث بنا کر وہ نتائج نکالیں۔ جن سے نسائی نفسیات اُجاگر ہوتی ہے۔

دوسرا باب ہمارے مطالعے کا بہت اہم حصّہ ہے۔ کیونکہ اس باب میں ادب کے معنی ومفہوم کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نفسیات کے معنی ومفہوم اور اس کے رشتے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چونکہ نفسیات ہی کے ذریعے ہمیں ادیب کے ذہنی اور تخلیقی عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس کی انفرادی حیثیت وشخصیت اس کی ذہنی پیچیدگیاں اور اس کی تخلیق کا منفرد رجحان سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن فرائیڈ کے نفسیات کی مطالعے کے نظریات کو مقبولیت حاصل ہونے کے بعد اسے ادب سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ اور نفسیاتی علوم کے تحت ادب میں بھی داخلی الجھنوں کی تفہیم وتعبیر کی کوشش کی جانے لگی۔ عام طور پر ادب کے لیے دل ہی کو سرچشمہ مانا جاتا ہے۔ چونکہ تخلیقی ادب جذبے کی مخصوص طرح کی شدت

اختیار کرنے پر ہی وجود میں آسکتا ہے۔ادب کے ان گوشوں کی پر چھائیاں ضروری ہیں۔ جہاں جدوجہد سے حیات کے حسین ہو جانے کی اُمیدیں ہیں۔اور جہاں زندگی کو سنوارنے کیلئے خون وجگر پیش کیا جاتا ہے۔اس طرح ادب اور نفسیات میں گہرا ربط پیدا ہو گیا۔اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد نفسیات کا اثر اُردو افسانے میں بھی دکھائی دینے لگا۔

تیسرا باب اس مقالے کا کلیدی باب ہے۔اس میں فنکار اس کے فن اور تخلیقی اظہار یعنی ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' میں افسانوں کے متون سے ظاہر ہونے والی نسائی آوازوں کو ایجاز واختصار کے ساتھ موثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترنم ریاض کے افسانے عورت کے استحصال اور سماج میں ان کی ثانوی حیثیت کے ردعمل کے طور پر تشکیل پاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں رشتوں کی بے رحمی، بڑے شہروں کے مسائل، مفلسی سے پیدا ہونے والے مسائل اور فرقہ وارانہ فسادات جیسے موضوعات نظر آتے ہیں۔ نفسیاتی مسائل پر انکی پکڑ مضبوط ہے۔پھر چاہے بچہ ہو یا بڑا سب کی شخصیت کو بخوبی پیش کرتی ہیں۔''یہ تنگ زمین، شہر، باپ، بابل، شیرنی، آدھے چاند کا عکس، مائیں'' وغیرہ ان کے بہترین نفسیاتی افسانے ہیں۔

حاصل مطالعہ میں اپنی تمام گفتگو کو سمیٹے ہوئے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان نکات کی وضاحت ہو جائے۔ جو ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے کے مطالعے کے دوران میری فکر کا حصہ بنے۔آخر میں ان کتابوں کی فہرست بھی شامل کر دی گئی ہے۔ جو میرے مطالعے میں رہیں۔اور مقالے کی تکمیل میں ان کتابوں کے اقتباسات کی شراکت اور ذکر لازمی قرار پایا۔

یہ اللہ کا ہی کرم ہے۔ کہ اس نے مجھ ناچیز کو لکھنے کی ترغیب دی، اور ایک ایسے مشفق استاد کی نگرانی سے نوازا جنہوں نے مجھ پر بھروسہ کیا۔ اور تحقیق کے دوران ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ حالانکہ میری ہمت اکثر کمزور پڑنے لگتی تھی۔ میں ان کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ کہ ان کا بھرپور تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا۔ تو شاید میں اپنا یہ مقالہ مکمل نہیں کر پاتی۔ اس تعلق سے شعبہ کے دیگر اساتذہ صاحبان کی بھی ممنون ہوں۔ جن کی رہنمائی، شفقت اور اعانت سے تعلیمی زندگی کی راہیں روشن ہوتی رہی ہیں۔ آخر میں اپنے والدین، بہنوں اور بھایئوں (مدثر نظیر، منظور بٹ) کے ساتھ ساتھ اپنے شریک حیات ڈاکٹر میر شار کی بھی مشکور و ممنون ہوں۔ جنہوں نے مجھے تحقیق کے دوران ہر قدم پر اپنا تعاون فراہم کر کے میری حوصلہ افزائی کی۔ بلکہ مجھے فرست کے لمحات بھی میسر کرائے۔

رُخسانہ بانو

باب اول

﴿2﴾

ترنم ریاض کی فکشن نگاری

ترنم ریاض کی فکشن نگاری

ریاست جموں وکشمیر میں شاعری کے بعد جس صنف ادب کوفروغ حاصل ہوا۔وہ افسانہ نگاری ہے۔آج کے بکھرے ہوئے انسان کے لمحاتی تجربوں کے اظہار کیلئے افسانہ ایک مؤثر وسیلہ ہے۔افسانہ تجربہ ہے مشاہدہ ہے احساس وبصیرت ہے۔افسانہ ایک تحریک بھی ہے افسانہ صدیوں سے دنیا کی مختلف زبانوں میں اپنے انداز اور اپنے اسلوب سے لکھا جارہا ہے۔ اوراُس وقت تک لکھا جائے گا جب تک ہمارے تخلیقی عمل میں سماجی ۔معاشی ۔تاریخی اور تہذیبی وابستگی کی بات ہوتی رہے گی۔

چونکہ کہانیوں سے دلچسپی نہ صرف فطرت انسانی کا ناگزیر جزو ہے بلکہ قصے،حکایتیں اور افسانے ہماری معاشرتی ۔تہذیبی اور تخلیقی کائنات کی تشکیل کا ابتدائی اور مستقل حوالہ بھی ہیں۔ فکشن ہماری اجتماعی بصیرت اور یادداشتوں کے تخلیقی اظہار اور خارجی حقیقت سے عہدہ برآ ہونے کے امکانات کوبھی خاطر نشان کرتا ہے۔جموں وکشمیر کی فکشن نگاری کا آغاز اگرچہ روایتی انداز سے ہوالیکن رفتہ رفتہ لکھنے والوں کے شعور میں بیداری پیدا ہوئی اور فکشن نگاری پراُن کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔صلاحیتیں اُبھرنے لگیں۔انہوں نے اپنے فن میں سماجی ،معاشی اور اقتصادی ، سیاسی ونفسیاتی باریکیوں کی عکاسی کرنا شروع کردی۔اورحالات واقعات کومقامی رنگ دیا۔ مقامی کرداروں کو پیدا کیا۔ اور خاصکر ریاست جموں وکشمیر کی سماجی اور معاشی صورتحال کااحاطہ اپنے انداز سے کیا۔!

ریاست جموں وکشمیر میں اردو فکشن (افسانہ) کی تخلیق کا سلسلہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے چل نکلا ہے۔اور جہاں تک نسائی افسانوی ادب کا تعلق ہے تو یہ سفر کچھ سُست رفتاری کا شکار رہا۔شاید اس وجہ سے کہ اکثر اوقات میں نسائی ادب کو کمتر ہی گردانا گیا۔ حالانکہ چودھویں صدی عیسوی میں عظیم شاعرہ لل دید نے اسی سرزمین میں وحدانیت کے نغموں سے یہاں کے ادبی روایت کی طرح ڈالی۔اس کے بعد حبہ خاتون، ارنہ مال اور نہ جانے کتنے نام ایسے ہیں جنھوں نے اس سرزمین کی ادبی روایات کو مالا مال کیا۔اور ایسے نام بھی ہو سکتے ہیں جن کی آواز مرداساس معاشرہ Male dominated society میں گُم ہوگئی مگر اب ہمارے ہاں ادب عالیہ کی تخلیق میں خواتین کا قابل لحاظ حصہ ہے گزشتہ نصف صدی سے مختلف تحریکوں کے نتیجے میں نسائی ادب کو فروغ کے لیے سازگار اور حوصلہ بخش ماحول پروان چڑھا۔ ریاست جموں وکشمیر میں جن خواتین نے اردُو شعروادب میں نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر اپنا مقام اور پہچان قائم کی ہے۔اُن میں ترنّم ریاض کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔جنھوں نے اردُو افسانوی ادب کی روایتی اقدار کا خیال رکھتے ہوئے جدید ترُ جحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے خواتین کے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو احساسات و جذبات، تجربات ومشاہدات کے علاوہ مرداساس سماج میں عورت کی حیثیت واہمیت اور اس پر ہورہے ظلم وستم کا برملا اظہار کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ترنم ریاض ریاست جموں وکشمیر میں ہی نہیں ۔ بلکہ کُلی طور پر اردو فکشن کی روایت کو مستحکم کرنے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ترنم ریاض ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے

تعلق رکھتی ہیں ۔ اردو فکشن میں وہ افسانہ اور ناول کے علاوہ صحافت ،تنقید اور شاعری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ اور ساتھ ہی برقی میڈیا سے وابستگی نے ان کے فن اور شخصیت میں ایک دانشورانہ دمق پیدا کردی ہے ۔جس کا مظاہرہ ان کی شاعری ، افسانوں اور ناولوں میں کُھل کر ہوتا ہے۔ ترنم ریاض نے ادبی دنیا میں اپنی محنتی کاوشوں اور دلجوئی سے ایک مقام بنالیا ہے ۔اگر چہ انہوں نے نثر کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ ایک کہانی کار ہیں ۔اور کہانی ان کا پہلا مشغلہ ہے ترنم ریاض ایک کتاب کے ابتداء میں خود لکھتی ہے کہ

> ''میں بچپن سے ہی کہانیاں سنتی تھیں ۔مگر کہانی سے میرا
> باقاعدہ تعارف تب ہوا تھا۔ جب میری آپا میٹرک میں
> پڑھتی تھیں ۔اُن کی اردو کی کتاب میں، میں نے منشی پریم
> چند کی دو کہانیاں پڑھی تھیں''۔
> ''انہی دنوں میں نے اپنی پہلی کہانی ''مصور'' لکھی تھی ۔
> اس وقت میں ریڈیو کشمیر سرینگر میں بچوں کے پروگرام
> کی باقاعدہ آرٹسٹ تھی۔لیکن یہ کہانی مجھ سے نوجوانوں
> کے پروگرام میں پڑھوائی گئی تھی جس کے بعد مجھے معلوم ہوا
> کہ کہانی کے ذریعے بہت سی باتیں کی جاسکتی ہیں سمجھائی
> جاسکتی ہیں'' [1]

اوپر کے اقتباس سے واقعی پتا چلا۔ کہ ترنم ریاض ایک کہانی کار ہے جسکو بچپن سے ہی کہانی

لکھنے کا فن اور شوق بھرا ہوا ہیں ۔ اور اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں کیا تھا ۔ کیونکہ وہ خود ایک واضح سوچ رکھتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور وفکر کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے اس حوالے سے ایک انٹرویو میں خود کہتی ہے ۔

''میرے خیال میں، میں بہت چھوٹی تھی ۔ جب میں نے
پہلا افسانہ لکھا تھا میرے خیال سے اُس وقت میں 7th
یا 8th کلاس میں ہوں گی ۔ اُن دنوں مجھے ترنم فریدہ کہا
کرتے تھے ۔ میرے مائیکے کا نام تھا اور میں نے اسی نام
سے لکھا بھی تھا'' ۲؎

ترنم ریاض کے افسانے ادبی و معیاری ہونے کی وجہ سے ملک کے معروف و مشہور جرائد و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں ۔ اور پھر بعد میں ان کی تخلیقات کو دنیائے ادب میں کافی سراہا گیا ہے ۔

ترنم ریاض ایک دردمند دل رکھنے والی حساس اور ذہین خاتون فکشن نگار ہیں جن کے افسانے اور ناول دل پر ایک گہر نقش چھوڑ جاتے ہیں ۔ اُن کے افسانوں میں معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر اور استحصال کی عکاسی خوب ملتی ہے ۔ ان کی ہر تحریر میں ہمیں گھریلو ماحول اور معاشرے کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے ۔ وہ جہاں ازدواجی زندگی پر لکھی گئی کہانیوں میں ایک ماہر نفسیات کی طرح باریک نکتوں پر فلسفیانہ، بحث کرتی نظر آتی ہیں ۔ وہیں طبقاتی

کشمکش عصری انتشار اوراس سے پیدا شدہ صورت حال کو کہانی لکھنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ظلم و جبر اور تشدد کے پس منظر میں لکھے گئے اُن کی کہانیاں کسی آشوب نامے سے کم نہیں ۔ایسے حالات میں واقعی وہ ایک ذی حس فنکار کی صورت میں نہ صرف تمام درد و کرب جھیلتی ہے بلکہ ایسے فن پاروں کے مطالعے سے قاری کے دلوں میں بھی ایک ٹیس اُٹھتی ہے۔اور ترنم ریاض کے ہاں جمالیاتی احساس کی کوئی کمی نہیں۔بقول صفیر ابراہیم

'' ترنم ریاض کو مصوری ، سنگتراشی اورموسیقی سے رغبت ہے چرند و پرند، حیوانات و نباتات سے انسیت ہے ۔فن میں ڈوب کر کچھ پالنے کی جستجو ہے ان کا یہ جمالیاتی احساس ان کے فکشن میں بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے ۔ ترنم ریاض اپنے موضوعات عام زندگی سے چنتی ہیں انکے ہاں علامتیں ان کی فکری زمین سے پھوٹتی ہیں ۔وہ کہانی کی بنت میں فضا اور ماحول سے بھی علامتیں یا اشارے اکٹھا کرتی ہیں ترنم ریاض کے فکشن کا یہ بنیادی وصف ہے کہ کہانی جہاں ختم ہوتی ہے ۔قاری کے ذہن میں اپنی تکمیل کی طرف سے نئے سرے سے بڑھنے لگتی ہے۔اوراس طرح قاری خود بھی مصنفہ کے تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتا ہے۔ ۳ے

ترنم ریاض کی افسانوی دنیا سب سے الگ اور منفرد ہے، ان کے افسانوں میں ہر قسم کے احساسات، جذبات، مشاہدات اور تجربات کی عکاسی نہایت ہی نازک انداز سے ملتی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ان کی تحریر ملتی ہیں جس میں خاص طور سے عورتوں کے مسائل کو

اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں ۔ چونکہ عورت تخلیقی عمل کے تمام تر ذائقوں سے آشنا ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ کسی بھی فن پارے کی تخلیق میں وہ نہ صرف اظہار ذات بلکہ حیات و کائنات کے تمام رموز و اسرار کو نہایت حُسن وخوبی سے ادا کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں ۔ اور اس ضمن میں ترنم ریاض اپنی کاوُشوں سے کامیاب نظر آتی ہیں ۔

بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ:

''ترنم ریاض کے نام پر بہت سے لوگ چونکیں گے لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ادب کی دنیا میں اپنی آہٹ سے یا آہنگ سے لہجے سے معنویت یا افسانویت سے چونکانا بھی ایک جمالیاتی عمل ہے''۔

جب جب کوئی نئی آواز ادب کے گنبد ہزار در میں ابھرتی ہے۔ تو کسی کو اندازہ نہیں ہوتا۔ آیا یہ پہلی آہٹ کے بعد ڈوب جائے گی یا دیوار و در سے ٹکرا کرار تعائش پیدا کرے گی اور سینوں کو برماتی جائے گی۔ ترنم ریاض وادی کشمیر کا گل نورس ہے۔ جس نے افسانے کی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ جہاں زمین سخت ہے اور آسمان دُور ہے، دنیائے ادب کی رونق کے لئے نئے فنکاروں کا آون جاون'' بنار ہے، تو بہت خوب ہے، فنکاروں اور ہر فن پارہ میرے آپ کے کہنے سے نہیں اپنے حُسن وخوبی سے زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے۔ اور میں اُن لوگوں میں سے ہوں۔ جو اس حق کا احترام کرتے ہیں خدا کرے کہ

ترنم ریاض ادب کی ہر موج سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہو سکیں۔

(1998ء) ۴ے

اوپر کے اقتباس کو دیکھا جائے تو۔ترنم ریاض واقعی کشمیر کی گل نورس ہے۔جنہوں نے یہاں کے حالات واقعات مسائل ومشکلوں کو اپنے افسانوی ادب میں جگہ جگہ پر ذکر کیا ہے ۔اور ترنم ریاض کی پہلی آہٹ ہی افسانوی دنیا میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی اور اسطرح نسائی ادب کے خوش آئیندہ دور کی شرورعات ہوئی ۔کیونکہ ترنم ریاض جموں وکشمیر کی وہ مشاق ادیبہ ہے جن کے افسانے نہ صرف ادبی سرمایے میں ایک اِضافے کی صورت رکھتے ہیں ۔ بلکہ جموں وکشمیر کے حوالے سے نسائی ادب کی سمت ورفتار متعین کرنے اور ایک ٹھوس معیار قائم کرنے میں معاون ومددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

غرض ترنم ریاض ایک ایسی باغبانہ ذہنیت کی حامل خاتون ہے۔جو اپنے ہر افسانے میں عورت کی نفسیات اُس کی جمالیاتی لچک اور حسیت کے کئی پہلوؤں کو مردانہ ظلم واستحصال کے حوالے سے پیش کرتی ہیں عورت کی ازلی محرومیوں اور اُلجھنوں کا صدمہ ہمیشہ ترنم ریاض کی آنکھوں اور دل میں موجود رہا ہے ۔حالانکہ وہ خود کلامی کے انداز میں کہانی سنانے کی عادی ہیں۔سماج میں جو کچھ اچھا برا دیکھتی ہیں۔اسے ایک حساس کہانی کار کی طرح قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں ۔چونکہ ترنم ریاض ایک جہاں دیدہ خاتون ہیں جن کے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہوتا ہے۔بقول پروفیسر عتیقہ اللہ رائے دیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

''ترنم ریاض کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ کسک ہے جسے

ایک ٹیس کی طرح ان کے افسانوں کے بطن میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ
ان کے افسانوں کا ماحول اور سارا سیاق بے حد خوش آگیں ہے۔ لیکن اسی خاموشی
کے اندر جو بلا شور برپا ہے۔ اسے ان کا قاری بہت محسوس کر لیتا ہے۔ ترنم ریاض میں
چیزوں کو ان کے اندر اُتر کر دیکھنے کی جو صلاحیت ہے۔ وہ ایک افسانہ نگار کے لئے
بڑی نیک فال ثابت ہوتی ہے''۔ ۵؎

ترنم ریاض کے افسانوں میں تصوف کی ایک سرمتی جھلکتی ہے جن کے یہاں باپ، ماں،
بیٹی کے افسانے بہت ملتے ہیں ان کے افسانے انفرادی انسان کے افسانے ہوتے ہیں۔ جو
اسی طرح اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں حالانکہ وہ حساس ذہن، سماجی وسیاسی رجحانات پر ان
کی گہری نظر، قومی و بین الاقوامی پُرآشوب حالات کا علم اور اُن کے پر تجسس ذہن کی عکاسی
کرتے ہیں۔ مگر ان کے اندر کی عورت جو بقول ان کے ایک پیدائشی ماں ہے جس انداز سے
ان معاملات کو محسوس کرتی ہے۔ وہ ان کی تحریروں کو کالم نگاری اور صحافتوں سے ممتاز کرتی ہے۔
ترنم ریاض خواتین پر ناروا زیادتیوں پر نہ صرف احتجاجی لہجہ اختیار کرتی ہیں۔ بلکہ سماج کو ٹھیکے اور
طنزیہ وار بھی کرتی ہیں ایک اقتباس میں ترنم ریاض نے عورتوں کی زیادتیوں کے حوالے سے
اس طرح لکھتی ہیں۔

''یہ ایک اذیت ناک سچائی ہے کہ تشدد کی شکار یہی نازک صنف ہوا کرتی ہے''
اس کے بعد حقیقت کے بارے میں طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے یوں لکھتی ہے
''میں ڈبلیو ڈبلیو ایف (WWF) کی سٹیر وائڈ کے ذریعے پٹھے نمایاں کرنے

والی عورتوں کا ذکر نہیں کر رہی۔اس عام عورت کی بات کر رہی ہوں جو ممتا اور
محبت کی بنی ہوتی ہے۔اور زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے جان تو حاضر کر سکتی ہے
مگر آدھی رات کو دوا کی تلاش میں گھر سے باہر نہیں جا سکتی۔اللہ تعالیٰ نے یہ
فضلیت مرد کو عطا کی ہے۔ ؂۶

ترنم ریاض نے اپنے بہت سے افسانوں میں ''عورت'' کو موضوع ٹھہرایا ۔عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رؤیوں کو اپنے افسانوں میں سمیٹ کر نسوانی جذبات اور احساسات کو بڑی لطافت اور شگفتگی کے ساتھ پیش کیا۔ بلکہ عورت کی زندگی کے اُن تمام منفی اور مثبت پہلوؤں کی بھی نشاندی کی جو مشیتِ ایزدی یا مصلحت خداوندی قرار پائی ہیں۔
عورت کی ظلم وستم واستحصال کی بات کرتے ہوئے ترنم ریاض ایک اور جگہ لکھتی ہیں۔

''میں اُس عورت کی بات کر رہی ہوں جس کا ہتھیار جس کی دُعا
جس کی اُمید صرف اس کے آنسو ہوا کرتے ہیں۔۔جنھیں وہ
ساری عمر کثرت سے بہاتی رہتی ہے۔میں اس عورت کی بات
کر رہی ہوں۔جس کا دل ستم سہہ سہہ کر اتنا کمزور ہو جاتا ہے
کہ بات بات پر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں'' ؂۷

اوپر کے اقتباس کی وضاحت کرتے ہوئے ۔ راقم یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا واقعی عورت اتنی کمزور ہیں ۔ اور کیا اس کا دل اتنا کمزور ہے کہ بات بات پر روئیں ۔ ایسا نہیں ۔ بلکہ حالات واقعات ایسے بنتے ہیں ۔ کہ عورت کمزور پڑ جاتی ہے ۔ سماج اور سماج میں رہنے والے لوگ ایسے بن جاتے ہیں ماحول ایسا بن جاتا ہے ۔ کہ استحصال کی شکار عورت جب سب کچھ چپ چاپ سہہ لیتی ہے اور تشدد کی شکار عورت بن جاتی ہے اور پھر رونے کے سوا کچھ نہ کر پاتی ۔

غرض ترنم ریاض کے بہت سے افسانوں میں عورتوں کی روداد غم کی کہانی ہیں اس کے کئی وجوہات ہو سکتے ہیں ۔ ایک ترنم ریاض خود عورت ذات ہیں کیونکہ عورت کی کہانی عورت ہی سمجھ سکتی دوسرا ایسا ماحول جس میں عورتوں کو سب سے زیادہ ظلم سہنا پڑا جس میں کشمیر کا ماحول یہاں کے خراب حالات وغیرہ شاید یہ بھی وجہ ہے کہ انہوں نے عورت کے ظلم وستم ، استحصال وغیرہ کو اپنے افسانوں میں لکھا ہے ۔

ترنم ریاض نے آج کے حالات اور زندگی کے بے رحمی اور انسانیت سوز حرکتیں کشمیر اور دوسری جگہوں پر ہو رہی ہیں ۔ ان سے دو چار کرانے کی کوشش کی ہے ۔ ترنم ریاض نے عورت ہونے کے ناطے عورت کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور عورت کی زندگی سے گہری وابستگی کا احساس ان کے افسانوں میں بار بار ابھرتا ہے ۔ جن میں عہدِ حاضر کے واقعات کا عکس پیش کیا ہیں افسانہ ''ناخدا'' میں بھی ایک ایسی کہانی بیان کی گئی ہیں ۔ جس میں عورت کو انتہائی بے بس و مجبور اور قابل رحم حالت میں دکھایا دگیا ۔ جس میں عورت اپنے شوہر کی تمام خرمستیاں ایک حدتک برداشت کرتی رہی اور جب عورت کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تو پھر

وہ احتجاجی رویہ اختیار کر بیٹھی ۔ترنم ریاض اس افسانے میں جہاں ایک بے بس اور مجبور عورت کی اپنے سنگ دل اور مغرور اور غیر حساس شوہر کی طرف سے بے توجہی اور بے قاعدہ زندگی پر مایوس کن جذبات کا اظہار کر رہی ہے۔ وہی دوسری طرف مردانہ بالا دستی پر کاری ضرب لگاتی ہے ۔کہ آج بھی ہمارے سماج میں ایسے مرد حضرات موجود ہیں جو آدھی آدھی رات کو ہوٹلوں ،کلبوں میں شراب پینے کے بعد اپنے گھر لوٹتے ہیں ۔ اور لڑکھڑاتے ہوئے بیوی بچوں پر برس پڑتے ہیں۔

بقول ترنم ریاض:

''ماں نے مجھے دو برس بعد دیکھا تھا۔تو رو پڑی تھیں۔
حالات سے لڑلڑ کر تھک چکی تھی ۔اپنے آپ کو بھول
کر صرف اپنے غم کو ہی یاد رکھے ہوئے تھی میں ۔اب
میں صرف گھر سنبھالنے والی گرہستیں تھی اور ان کے
بچے کی ماں ۔اب انھیں مجھ میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی تھی''۔ ۸

ترنم ریاض ایک حساس عورت ہیں ۔انہوں نے عورت کے جذبات و احساسات اور اس کی نفسیاتی کیفیتوں کی بڑی خوب صورت عکاسی کی ہے۔

اسی طرح افسانہ ''بلبل'' میں ازدواجی زندگی اور آسودہ حال کی کہانی نہایت موثر انداز میں بیان کی گئی آسودہ حال زندگی اس لئے کہ اس میں عورت بے زبان ، خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی ہے۔جس کا احساس تک بھی اس کے شوہر کو نہیں ہوتا۔اور عورت سے ہر وہ کام کر

لیتی ہے جس سے اس کا شوہر خوش ہوتا۔اصل میں اس افسانے میں شوہر کا کردار ایک ایسے طبقے کی عکاسی کرتا ہے۔ جن کی سوچ اس قدر کمزور ہتی ہے کہ وہ عورت (بیوی) کو غلام سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہاں عورت کو تکلیف پہنچنے پر بھی اپنے دُکھ کا اظہار کرنا لازمی نہیں سمجھتی۔ بلکہ اپنی تمام تر خوشیاں اپنے گھر شوہر،اولاد کی خوشی کی خاطر قربان کرتی ہے وارث علوی اپنے ایک مضمون میں افسانہ بلبل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔درد کی تین منزلیں ہیں۔۔۔۔۔جذباتی،جسمانی
اورروحانی۔جسمانی تکلیف میں عموماً جذباتی اورروحانی تکالیف
دب جاتی ہیں۔ہرمعاملے میں عورت کی خاموشی سعادت مندی اسی
ذہنی حالت کوظاہرنہیں ہونے دیتی۔ایسا لگتا ہی نہیں کہ اس کی روح ہے،
اس کے بھی جذبات ہیں۔وہ تو صرف ایک جسمانی وجود ہی نظر آتی ہے
جو ہر خدمت کے لیے حاضر اور رضامند ہے"۔ ۹؎

اسی طرح ترنم ریاض کے بیشتر افسانوں وناولوں میں کشمیر کی زندگی اس کا درد کرب اور مسائل آج کے حالات اور زندگی کی بے رحمی اور انسانیت سوز حرکتیں جو کشمیر اور دوسری جگہوں پر ہوری ہیں۔ان کو فنکارانہ انداز سے اُبھارا ہے"برف گرنے والی ہے، میرا پیا گھر آیا ،بابل،متاع گم گشتہ" میں گھر آنگن کی زندگی نمایاں ہے۔ان افسانوں میں ان کسک اور ٹیس کو باآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔جو کشمیری عوام کی زندگی ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''چند دھائیاں پہلے ترنم ریاض وادی کشمیر کے ایک گل نورس کی حیثیت سے ادب کے دشتِ بے اماں، انہماک اوں میں داخل ہوئی تھیں۔ جہاں زمین سخت اور آسمان دور ہے ادب کی دنیا عجیب کشاکش کی دنیا ہے۔ جہاں اچھے اچھوں کا ملمع دھلتے دیر نہیں لگتی۔ترنم ریاض اپنی لگن۔دلسوز انہماک اور انتھک محنت کی وجہ سے آج معاصر اردو شاعری اور فکشن دونوں میں اپنی پہچان بنا چکی ہیں اور معروف حثیت رکھتی ہیں۔ یہ وقت ہی طے کرے گا کہ وہ شعری میں آگے ہیں یا فکشن میں آثار تو فکشن ہی کے نظر آتے ہیں ادھر انھوں نے موجودہ چلینج کشمیری عورت کے دکھ درد اور تیزی سے بدلتے ہوئے کلچر سے جرے مسائل پر بھی غور کیا ہے۔ ۱۰

اوپر کے اقتباس کی وضاحت کرتے ہوئے راقم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ترنم ریاض واقعی فکشن میں آگے ہیں۔اور اکیسویں صدی کی معتبر اور سنجیدہ فکشن نگار ہیں۔جنہوں نے اپنے فکشن میں نہ صرف کشمیر کی درد بھری کہانی۔ بلکہ یہاں کے حالات واقعات،عورتوں کے مسائل،ازدواجی زندگی اور خاصکر کشمیر کی ثقافت کا ذکر بغور اپنے ناولوں اور افسانوں میں کیا ہے۔جس کی بھرپور نمائندگی ان کے ناول ''برف آشنا پرندے'' میں مل رہی ہے۔یہ ناول ایک مسلم کشمیری خاندان کے تہذیبی زوال کی کہانی ہے۔یہ ناول اپنے زمانی، مکانی،تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن اس کی زخم خوردہ روح،قوت تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزرگاہوں

اور حال میں زندگی کے افق پر نئی تاب و تپش اور معنویت پر مبنی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی کہانی ہے ۔اس ناول کا سب سے اہم اور نا قابل فراموش پہلو، جو پیش کیا گیا وہ اپنے تاریکی و تہذیبی سرمایہ اور دانشوری کی صدیوں پرانی روایات میں جو نہ تو مظاہر ہمہ دانی کے لیے پیش کی گئی ہیں، اور نہ رعب ڈالنے کے لئے بلکہ یہ ناول Structure میں جس طرح پیوست ہیں ۔انھیں ناخن و گوشت کی آمیزش سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے اس ناول کے بارے میں پروفیسر قاضی عبدیل الرحمٰن حاشمی نے اپنے ایک مضمون ''ذرافشاں تخیل کا ترجمان'' میں لکھتے ہیں۔

اس ناول کو برصغیر میں 1980ء کے بعد لکھے گئے تانیثی فکشن
کے ایک اہم اور معنی خیز حوالے کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ [۱۱]

پروفیسر حامدی کاشمیری کے نظریہ تنقید سے استفادہ کرتے ہوئے اگر اس ناول کے بارے میں یہ کہا جائے کہ فن کار کے وجدان اور مرتعش احساس کے بدولت پر برا تخلیقی کار نامہ ایک طرح کے مکاشفے Apcololypse پر تمام ہوتا ہے۔تو غلط نہ ہوگا۔

واقعی ترنم ریاض کا یہ ناول (برف آشنا پرندے) ایک چمن کی مانند ہے جس کی سیر کر کے دل شاداں ہو جا تا ہے ۔اسی لئے اس ناول کو کئی نا قدین نے اکیسویں صدی کی پہلی دھائی کا اہم ترین ناول قرار دیا ہے۔''برف آشنا پرندے'' کی موضوعاتی ،فکری ،ثقافتی انفرادیت کی بناء پر ترنم ریاض کا شمار بجا طور پر موجودہ دور کے نمائندہ ناول

نگاروں میں ہوتا ہے۔

﴿17﴾

جہاں تک ترنم ریاض کی کردار نگاری کا سوال ہے وہ اس لحاظ میں بہت حساس نظر آتی ہیں۔اور اپنے کرداروں کی نس نسِ سے واقف رہتی ہیں۔کیونکہ ان کے کردار کسی دوسری دنیا کے مخلوق نہیں بلکہ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں پل رہے کردار ہوتے ہیں۔سائنس وتکنالوجی کی تیز رفتار زندگی میں عورت کی مجبوریاں ومسائل اور احساسات وجذبات کو کہانی بند کر کے کرداروں کے ذریعے عیاں کیا ہے کیونکہ ترنم ریاض نہ صرف ایک اچھی کہانی کار ہیں۔بلکہ زندگی کے نگار خانے کا گہرا شعور بھی رکھتی ہیں۔اور Gender based کہانیاں لکھنے سے گریز کرتی ہیں بلکہ ان کے افسانے فردِ کائنات کی کہانی معلوم ہوتے ہیں اور اپنے ارد گرد کے حالات کی نہایت عمدہ عکاسی کی ہے۔کیونکہ ترنم ریاض کے افسانے ،افسانے نہیں لگتے بلکہ معاشرے کی منہ بولتی تصویریں بن جاتے ہیں۔کہانی ، پلاٹ ،کردار، واقعہ نگاری ، جزئیات نگاری نفسیاتی دروں بینی اور ڈرامائی کشمکش کا وہ پورا خیال رکھتی ہیں اُن کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے پڑھنے والے کے دِل کو متاثر کرتا ہے۔کیونکہ یہ ترنم ریاض کا انداز تحریر اور اسلوب میں خاص طور کی مقناطیسیت ہے۔جو بہت ہی صفائی اور سادگی کے ساتھ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔

مظہر امام ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

> ’’ترنم ریاض کے افسانوں کی جو فضا ہے بڑی مانوس فضا ہے۔
> جس سے ہم واقف ہیں۔ان کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز
> صناعی نہیں ہے۔بہت ہی صفائی اور شستگی کے ساتھ وہ اپنے افسانوں
> کا تانا بانا بنتی ہیں۔کہیں کہیں تو ان کے اسلوب میں خاص طرح

کی مقناطیسیت آجاتی ہیں۔ جواپنے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو
باہر لے جاتی ہے۔ترنم ریاض اپنی سادگی بے تکلفی اور بے ساختگی
کی وجہ سے ہمیں ہمیشہ متاثر کرتی ہیں‘‘ ۱۲؎

الغرض ترنم ریاض اردو فکشن کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کر چکی ہے۔جن کے یہاں کہانی پن اور کہانویت اچھی خاصی ہے جو زبان کے استعمال میں نہایت سلجھی اور سنجیدہ فکشن نگار تصور کی جاتی ہے۔ان کے یہاں افسانوی کائنات میں مقامیت اور مقامی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ مختصراً کہہ سکتے ہیں۔ کہ ترنم ریاض ریاست جموں وکشمیر کی سب سے مشہور اور ایواڑ یافتہ فکشن نگار خاتون ہے۔جنہیں اپنی شعری کائنات ناولوں اور افسانوں کی بناء پر جو شہرت اردو دنیا میں ملی وہ بعض اعتبار سے قابل غور ہے۔ ریاست کے خواتین فکشن نگاروں میں شائد ہی کسی اور فکشن نگار کو اتنی جلدی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ،جتنی کہ ترنم ریاض کو ملی اور اتنا ہی نہیں۔ بلکہ اُردو کے ناقدین خصوصاً گوپی چند نارنگ ، وارث علوی جیسے ناقدوں نے اُن کے فن کو سراہا اور اُن پر لکھا۔

ترنم ریاض :۔ایک مختصر تعارف

ریاست جموں وکشمیر میں جن خواتین نے اردو شعر وادب میں نہ صرف ریاستی بلکہ ملکی سطح پر اپنا مقام اور پہچان قائم کی ہے۔اُن میں ترنم ریاض کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ترنم ریاض اگست 1963ء میں سرینگر میں پیدا ہوئی۔ چودھری محمد اختر خان اور ثریا بیگم کی اس بیٹی نے اس ماحول میں پرورش پائی۔ جو اپنے وقت کا رئیس ترین خاندان تصور کیا جاتا تھا۔ ان کے دادا چودھری خدا بخش خان اپنے وقت میں کشمیر کے وزیر وزارت تھے۔ اور اُس وقت کے با اثر لوگوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ ترنم ریاض کی دادی اُس زمانے میں پرائمری سکول کی ٹیچر تھیں۔ ان کے والدین بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ یعنی ان کے خاندان کا تقریباً ہر فرد تعلیم یافتہ تھے۔ ترنم نے ابتدائی تعلیم گرلز سکول کرن نگر سرینگر میں حاصل کی۔ اس کے بعد وومنز کالج سے گریجویشن اور کشمیر یونیورسٹی سے بی ایڈ، ایم ایڈ اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ ترنم ریاض کی ادبی سفر کا آغاز اگر چہ 1973 میں ہوا۔ ابتدا انہوں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور نوعمر کی شاعری جیسے تخلیقی اظہار سے اہل کمال اور اہل بصیرت کو متاثر کیا۔ اس حوالے سے وہ خود فرماتی ہیں

> جب میں نے پہلا افسانہ لکھا تھا۔ میرے خیال سے اُس
> وقت 7th یا 8th کلاس میں ہوگی۔
> افسانے کا نام میں نے کچھ اور ہی رکھا تھا۔ لیکن جس اخبار
> میں وہ چھپا تھا ''آفتاب اخبار نکال کرتا تھا'' اس میں انھوں
> نے کسی اور نام سے شائع کیا تھا۔ اور میں نے ایک بڑے
> (کنٹرورشل (contraversal)) متنازع سے ٹاپک (Topic)
> یہ لکھا تھا۔ بچی تھی میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب کوئی شخص
> اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے تو اس کے بعد ایک رسم ہوتی ہے
> یا پھر اسی شخص سے نکاح کرنے کیلئے ایک ضرورت۔ شرعی ضرورت

جیسے ملالہ کہا جاتا ہے۔ یہ سسٹم یا ضرورت میری سمجھ سے باہر تھی۔

میں نے وہ افسانہ اسی کے خلاف لکھا تھا'' ۱۳؎

اوپر کے اقتباس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اتنی کم عمری میں چھوٹے سے ذہن میں فکر کس قدر توانا تھی۔ اور اسطرح کہانی لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی رواں دواں ہے۔ اور اردو ادب کی ایک معتبر شاعرہ ترجمہ نگار، ناول نویس، افسانہ نگار اور محقق و نقاد کی حیثیت سے اپنی لیاقت و قابلیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔ از دواجی زندگی کے اعتبار سے ترنم ریاض کو خوش بختیاں راس آئیں۔ اور پروفیسر ریاض پنجابی جیسے ذہین متعین، مُفکر و مُد براور دیانت دار اسکالر اُن کے شریک سفر بنے۔ ترنم ریاض کی فکری تشکیل میں پروفیسر ریاض پنجابی کا ایک اہم رول رہا ہے۔ انھوں نے ترنم ریاض کی حوصلہ افزائی ہر طرح سے کی اس سلسلے میں ترنم ریاض خود فرماتی ہیں۔

''ہم اُن سے بہت خوش ہیں۔ کہ اتنا اچھا شریک
حیات ہمیں ملا۔ شائد ہماری قسمت اچھی تھی، انہوں
نے مجھے اُبھارا'' ۱۴؎

ترنم ریاض کی تصانیف اعلیٰ وادبی معیار کی حامل ہیں۔ اُن کی جو تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔ اُن میں چار افسانوی مجموعے ''یہ تنگ زمین'' (۱۹۹۸) ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' (۲۰۰۰)، یمبرزل (۲۰۰۴) اور میرا رخت سفر (۲۰۰۸) شامل ہیں۔ دو ناولیں

''برف آشنا پرندے (۲۰۱۰)، اور ناول '' مورتی (۲۰۰۴)'' تحقیق وتنقید کی دو کتابیں ۔ چار ناویلا (فریب خط گل) مضامین کا مجموعہ (اجنبی جزیروں میں) کئی شعری مجموعے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے ادبی حلقوں میں نہ صرف پذیرائی حاصل کرتے رہیں ہیں بلکہ ایک منفرد طرز لحن اور انفرادی اسلوب نگارش کا احساس دلاتے ہوئے ترنم ریاض کے تشخص کو رات دو گنا اور دن چوگنا استحکام عطا کرتے رہتے ہیں۔

جہاں تک ترنم ریاض کی شاعری کا تعلق ہے وہ بے شک ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہیں۔ جو زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں ترنم ریاض نے نسوانی جذبات واحساسات کو اپنے غزلوں اور نظموں میں بڑی لطافت اور شگفتگی کے ساتھ پیش کیا۔ غزلوں کے مقابلے میں اُن کا تخلیقی جوہر نظموں میں اور زیادہ کُھل کر سامنے آیا ہے۔'' آزاد نظم اُن کے نزدیک ایسی پسندیدہ صنف سخن رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے رنج والم، احساسات، تجربات اور مشاہدات کے علاوہ مرد اساس معاشرہ میں عورت کی حیثیت واہمیت اور آنے والے ظلم وستم کے واقعات ومشاہدات کا برملا اظہار کر رہی ہیں۔اسی طرح ناول کے اعتبار سے ترنم ریاض نے اب تک جو ناول قلمبند کئے ہیں ان میں سے ''برف آشنا پرندے'' اور '' مورتی'' ۔''برف آشنا پرندے'' ناول میں ترنم ریاض نے کشمیر کے جغرافیائی حالات کشمیر کی ثقافتی تہذیب اور تاریخی ورثے کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر اور کشمیریت کے مختلف پہلوں کو اپنے انداز سے پیش کیا۔

ناول ''مورتی''میں عورت کے مسائل اور اہم جہت نسائیت کی بھی ہے۔ یہ ناول مرد

اساس معاشرے کے اُس چلن کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہے جہاں عورت کے جذبات اوراحساسات کو بے وقعت گردانا جاتا ہے۔

ناول کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں بھی ترنم ریاض ایک معتبر نام ہے ۔اُن کے افسانوں میں کشمیر کی زندگی اس کا درد، کرب اور مسائل کو فنکارانہ انداز سے اُبھارا ہے ۔اور تقریباً تمام افسانوں میں عورت کے جذبات واحساسات ، برماں نصیبیاں ،آہیں سسکیاں ، آنسو درد وکرب اور گھٹن کے ساتھ ساتھ مردانہ بالا دستی کے خلاف بغاوت اور احتجاجی رویہ موجود رہتا ہے کیونکہ ترنم ریاض ایک جہاں دیدہ خاتون ،وسیع القلب اور وسیع النظر ہونے کی وجہ سے اُن کے افسانوں کا کینوس بھی کافی وسیع ہے۔

افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

> ''ترنم ریاض اپنے ہر افسانے کو کہانی بنا دیتی ہیں۔کردار نگاری، منظر نامہ مکالمہ نگاری سب کچھ تخلیقی بیانیہ میں اس طرح سمو دیتی ہیں کہ قاری،سامع ،متحیر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ۔وہ اپنے ہر ساختیہ کو ترقی پسندی، جدید اور مابعد جدیدت سے پرے رکھتی ہیں اور ہر ممکنہ مستقبل کو جی لینے کی کاوش ہیں ۔نثر میں شاعری جگانا، آسان نہیں ہیں وہ اپنے اس منفرد ہنر میں اس لئے کامیاب ہو جاتی ہیں ۔کہ شاعرہ بھی ہیں ۔ان کا ہر دلچسپ وقوعہ،سنجیدگی کی سربراہی میں نقادوں کے قلم پر دستک دیتا ہے۔کہ افسانہ کی تنقید اگر لکھنی ہے تو مجھے پڑھو،لکھو،اور سمجھو'' ۱۵؎

ترنم ریاض کی فکری تشکیل میں گردوپیش کا تغیر وتبدل، انسانوں کے بدلتے خیالات ورجحانات، کردار واطوار اور طرز زندگی بھی کارفرما ہیں۔ آج کے انسان کی زندگی سے جُڑے مسائل و مشکلات کا مشاہدہ ترنم ریاض نے بغور کیا ہے۔ کیونکہ ترنم ریاض اپنے وجود میں ایک عالمی فکر رکھتی ہیں۔ظلم وجبر کے خلاف ان کی فکر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

برصغیر میں بلندترین اورنہایت حسین خطے یعنی کشمیر کی سرزمین سے ترنم ریاض کے نام سے اُبھرنے اور ادبی سفر میں شبانہ روزنئی فتوحات سر کرنے کے صلے میں ترنم ریاض کو اب تک کئی قومی اور بین الاقوامی یعنی عالمی سطح کے، ملکی سطح کے اور صوبائی سطح کے بہت سے ایواڑ اور اعزازات ملے جس میں 2014ء کو سارک SAARC) لٹریٹ ایواڈ، اُتر پردیش اردو آکیڈمی فکشن ایواڑم ساحرلدھیانوی ادیب انٹرنیشنل ایواڑ، رسا جاودانی میموریل ایواڑ۔ جمو و کشمیر کلچرل ایکڈمی کی طرف سے Best Book ایواڑ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق کی کتاب بعنوان 'بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب' کو ساہتہ اکیڈمی کی طرف سے خاص پذ پرائی حاصل ہوئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی اس ممتاز ادیبہ اور قلمکار نے بہت سے قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت بھی کی جس میں SAARC کانفرنس، اردو دنیا کانفرنس''اسلام آباد اور امن کی آشا'' لٹریٹ فسٹول کراچی شامل ہیں۔

ترنم ریاض کئی ایڈویئزر (Advisor) بورڈوں کی ممبر بھی رہی ہیں جس میں سائتہ اکیڈمی ایڈوئیزر بورڑ، اردو ایڈوئیزر بورڑ نئی دہلی Urdu Advisory Board New Delhi اردو برالافونڈیشن سرسوتی سمان، غالب اکیڈمی بورڑ بھی شامل ہیں۔

ترنم ریاض گزشتہ کئی برسوں سے'' آل انڈیا ریڈیو' سے اردو میں خبریں پڑھنا ان کی

مصروفیات کا حصہ رہا ہے۔

غرض چند دہائیاں پہلے ترنم ریاض وادی کشمیر کے ایک گل نورس کی حیثیت سے ادب کے دشتِ بے اماں میں داخل ہوئی تھیں۔ ترنم ریاض اپنی لگن، دلسوزی، انہماک اور اَن تھک محنت کی وجہ سے آج اُردو دنیا میں اپنی پہچان اور معروف حیثیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ یہ تنگ زمین۔افسانوی مجموعہ۔ترنم ریاض ص نمبر۹ پبلشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۸ دریا گجن نئی دہلی۔

۲۔ اُردو دنیا نئی دہلی جلد ۱۸ شمارہ ۳ مارچ ۲۰۱۶ ص نمبر ۸

۳۔ مشمولہ رسالہ بازیافت ۲۰۰۹ مرتب مجید مضمر۔شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی شمارہ ۴۵ ص نمبر ۱۸۷۔

۴۔ ناول مورتی، مصنف ترنم ریاض، مشاہیرے کے سوچ رنگ میں، ص نمبر ۹۷، پبلشر دہلی پبلشنگ ہاوس نئی دہلی۔

۵۔ مشمولہ ماہنامہ، شاعر، ممبی ۲۰۰۴ شمارہ ۴ ص نمبر ۱۰۔

۶۔ اجنبی جزیروں میں مصنف ت۔ریاض، مضمون، چہ معنی دارد، ص نمبر ۴۶، پبلشر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۱۵۔

۷۔ ایضا صف نمبر ۴۷۔

۸۔ افسانہ 'ناخدا' افسانوی مجموعہ، یہ تنگ زمین، مصنف ترنم ریاض، ص نمبر ۱۰۲، پبلشر موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی ۱۹۹۸۔

۹۔ ترنم ریاض کی افسانہ نگاری، ورث علوی، مشولہ رسالہ بازیافت، مرتب مجید مضمر، شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی، شمارہ ۴۵، ۲۰۰۹، ص نمبر ۱۸۷۔

۱۰۔ ناول مورتی ''چند آرا مضمون میں''ص نمبر ۱۰۶، پبلشر، دہلی پبلشنگ ہاوس۔

۱۱۔ ایوان اُردو دہلی جلد نمبر ۲۳، شمارہ ۰۷ نومبر ۲۰۰۹ ص نمبر ۲۱۔

۱۲۔ اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد، مصنف ڈاکٹر احمد صغیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۹، ص نمبر ۲۷۵۔

۱۳۔ ماہنامہ اُردو دنیا نئی دہلی، جلد ۱۸ شمارہ مارچ ۲۰۱۶ ص نمبر ۸۔

۱۴۔ ایضا۔ص نمبر ۸۔

۱۵۔ رسالہ۔شاعر۔اپریل ۲۰۰۴۔

فصل باب ''ب''

ابابیلیں لوٹ آئیں گئی کی ادبی اہمیت

ابابیلیں لوٹ آئیں گئی کی ادبی اہمیت

’’ابابیلیں لوٹ آئیں گی ترنم ریاض کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو اکیس (21) افسانوں پر مشتمل ہے۔سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا۔ کہ آخر ترنم ریاض نے اس مجموعے کو یہ عنوان کیوں دیا ہے۔ کیونکہ جو لوگ اس واقعہ کی ترمیم اور تاریخی حوالے سے واقف ہیں۔ وہ تو یہ جانتے ہی ہوں گے کہ ’’ابابیل‘‘ ابرہہ اور کعبہ مقدس کا کیا واقعہ رہا ہے۔تو سوال ہے کہ کیا مصنفہ کے ذہن میں زندگی کی محرمیوں سے نجات کا کوئی سلسلہ ان کی کہانیوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ یا پھر مجبوریوں اور محرومیوں کو ترنم ریاض نے اپنی کہانیوں کی مدد سے تقویت دی ہے۔اور مایوس نہ ہونے کا سبق بھی پڑھانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ترنم ریاض ایک جگہ خود کہتی ہیں:۔

> ’’ہر انسان اپنے حسی اضطراب اور روحانی اسرار لیے جیتا ہے
> دنیا کا ہر ذی روح اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر چلتا ہے۔
> میرا اپنا خیال ہے کہ فن پارے کو ہر شخص اپنی کہانی اگر نہ سمجھے
> تو کم از کم اپنی کہانی کا کوئی حصہ ضرور محسوس کرے۔‘‘ ؂۱

ابابیل ایک چھوٹی سی چڑیا جس کے پر سیاہ اور کھال کے ہوتے ہیں اور سینہ اکثر سفید ہوتا ہے پرانے گنبدوں، کھنڈروں اور تاریخی مقامات پر مٹی کا گھونسلہ بنا کر رہتی ہیں۔عربی میں

اس کے معنی گروہ اور جھنڈ کے ہیں۔

اردو میں ابابیل کی تقریباً مقدس حیثیت ہے۔ کہ کنکریوں کی بارش سے اس نے ابراہہ کے لشکر کو مجروح کر دیا تھا۔ جو خانہ کعبہ پر یورش کرنے کے ارادے سے نکالا تھا۔ ابابیل چھوٹا سا پرندہ ہے سیاہ رنگ کا ہوتا ہے ابابیلیں پرندوں کے جھنڈ یعنی گروہ کو کہتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں بھی ہے۔ جھنڈ اس لئے کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پرندے جھنڈ میں ہی آتے ہیں اور جھنڈ میں ہی اُڑ جاتے ہیں۔

قرآن مجید کے سورہ فیل کے اندر جو طیراً ابابیل'' کہا گیا۔ تو اس کا مطلب ہے کہ ُغول در غول پرندے'' قطار در قطار پرندے یہ پرندوں کے آنے کی صفت ہے کہ وہ ابابیلوں'' کی صورت میں آئے۔ یہ پرندہ چھوٹی جسامت ہونے کے باوجود بھی دنیا کے بلند پرواز اور تیز رفتار پرندوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابابیل دس ماہ تک مسلسل پرواز کر سکتی ہے۔ جبکہ اپنے اس پورے سفر میں وہ ایک لمحے کیلئے بھی زمین پر نہیں اُترتی اور اڑنے کے دوران ہی اپنی غذا بھی حاصل کرتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے۔ کہ ابابیل مددگار پرندہ کی طرح ہے۔ اور ابابیلیں پھر لوٹ آئیں گئیں یعنی مظلوم پھر آزاد ہو جائیں گے اسی طرح ترنم ریاض نے اس افسانوی مجموعے میں جن کا تخلیقی فن ایک قدم اور آگے بڑھا ہے۔ کیونکہ کتاب کا عنوان ہی ان کی تخلیقی فکر کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ نسائی احساس کا اشاریہ بھی ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے عورت کو ہی زیادہ تر موضوع ٹھہرایا۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے ایسا ماحول دیکھا۔ جس میں کٹھن، درد، کرب، اور ہر شے پر محیط مایوسی تھی کیونکہ اس مجموعے میں

عورت، کشمیراورکشمیریت کی مظلومیت کو بیان کیا گیا ہے۔جس میں سماجی طور سے نیز معاشی اور مذہبی لحاظ سے عورت کے دُکھ درد کو بیان کیا گیا ہے کیونکہ ترنم ریاض نے انسانوں کے بدلتے ہوئے خیالات، کردار، اطوار، طرزِ زندگی کا بغور مشاہدہ کیا اور انسانی احساسات کو اپنے تخلیقی نہاں خانوں میں محفوظ کر کے کہانیوں اورافسانوں کا روپ دیا۔

اس مجموعے (ابابیلیں لوٹ آئیں گی) کے اکثر افسانوں میں عورت کی درد بھری کہانی اور دوسری طرف اسی مجموعے کی دوسری کہانیوں میں روحانی سکون پایا اور ذہنی تناو سے دو چار بھی ہوئے۔حالانکہ ترنم ریاض کے افسانوں کے زیادہ تر نسوانی کردار آخر میں مفاہمت کے دامن میں گزیں ہوجاتے ہیں اب سوال ہے کہ کیا عورتوں کے استحصال کی وجہ اُن کی لاعلمی یا جاہلیت ہے یا اصل میں مردوں کی ایک خاص ذہنیت ہے۔

حقانی القاسمی ابابلیں لوٹ آئیں گی کے بارمیں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''کہ آبا بیلیں لوٹ آئیں گی'' ۔میں ان کی تخلیقی فن ایک قدم اور آگے بڑھا ہے کہانی کتاب کا عنوان ہی ان کی تخلیقی فکر کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے ۔ اور یہ نسائی احساس کا اشاریہ بھی ہے ۔ انہدام کسی وجود کا ہو یا عمارت کا تہذیب کا ،تشخص کا جب انہدامی قوتیں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں اور ظلم کا دائرہ پھیل جاتا ہے تو غیبی قوتیں خود بخود نمو دار ہوتی ہیں ۔ترنم ریاض کے اس عنوان میں جو رمز اور تہہ داری ہے وہی ان کی تخلیقی فکر کا نشان بھی ہے ۔ گویا ترنم ریاض منتظر فردا ہیں ۔ اور صابر و شاکر خموشی کی زبان بن کر غیبی نصرت کی اُمید لگائے بیٹھی ہیں۔یہ عنوان کے Sensitivity of Mind

کومکمل طور سے ظاہر کرتا ہے۔تمام کہانیاں بشمول عنوان کتاب ان
کے"Femalness of Mind" کا اشاریہ ہیں۔اور ان کی نسائی
حیثیت اور ادراک کا اظہار نامہ بھی' ۲؎

اوپر کے اقتباس سے واقعی ظاہر ہوتا ہے کہ ترنم ریاض ایک سلجھی ہوئی فکر اور بالغ نظر فکشن نگار رہے ہیں۔اور ان کے افسانوں میں بھی اسی انداز کی مثالیں سامنے نظر آتی ہے، وہ سماجی تبدلیوں میں عورت کی حیثیت متعین کرنے میں اپنی ایک مخصوص سوچ وفکر رکھتی ہیں۔اور جب جب ظلم کا دائرہ پھیل جاتا ہے تو غیبی قوتیں خود بخود نمودار ہوتی ہیں۔چاہیۓ وہ سماجی، سیاسی ہو یا معاشی و مذہبی مسائل ہو ترنم ریاض نے تقریباً اپنے تمام افسانوں میں عورت ذات کی بھر پور وکالت کی ہے اور اُسے اپنے حقوق پر لڑنا سکھایا ہے۔ترنم ریاض عالمی حالات و واقعات سے مکمل طور سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی کائنات اور حیات کے مسائل کو انسانی نظر سے دیکھتی ہیں ۔

اس مجموعے کے کچھ افسانوں کو بڑی خوبی اور پذیرائی بھی حاصل ہو چکی تھی جن میں افسانہ، اماں''، ''بابل'، 'مٹی'، شہر' برف گرنے والی ہے'، 'اور میرا پیا گھر آیا' قابل ذکر ہیں ان افسانوں کو ناقدوں نے بھی سراہا۔اور ان افسانوں پر کئی تبصرے بھی ہوئے۔جیسے'افسانہ شہر' کے بارے میں سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں

''بھئی کیا کہانی لکھ دی۔'''شہر واہ واہ! شاید اردو میں
یہ پہلی کہانی ہے جو مہانگری نما شہر سے متعلق ہے''
مبارک ہو۔ ۳؎

افسانہ ''مٹی'' میں انہوں نے جس طرح معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو پیش کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی سماج میں جو فضا اور کشمکش ہے اس کی وجہ خود ہم اور ہمارے لوگ ہیں۔ ہمیں ان پریشانیوں، ظلم و جبر سے نجات حاصل کرنے کیلیے خود کو غیبی طاقت اپنے میں لانے کیلیے اب اور زیادہ ظلم براداشت نہ کر کے شکست کو کامیابی میں بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ترنم ریاض افسانہ ''مٹی'' کے بارے میں خود لکھتی ہے۔

> '' کہ افسانہ مٹی نے بھی از حد سنجیدہ کیا تھا۔ اس افسانے
> کو تحریر کرنے سے پہلے میں کچھ دیر کیلئے اُس ماحول میں رُکی تھی۔
> وہاں کی گھٹن، درد، کرب اور ہر شے پر محیط مایوسی میرے اندر
> جذب ہوگئی تھی تب ''مٹی'' کا ظہور ہوا تھا۔ ؎ ۴

اسی طرح افسانہ ''برف گرنے والی ہے'' میں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ آج کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی سوچ اور عملی صورت کی تیزی کو گامزن رکھیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب حالات سے مقابلہ کر کے اس نظام کے خلاف اپنی آواز بلند کریں جو ہمیں مستقل پیش رہا ہے اور اس استحصالی نظام میں ہم کو ایک نیا اعتماد، نیا چلینج اور نئی انا کے ساتھ آنا ہوگا اور اگر ہمارے اندان چیزوں کا جذبہ نہ ہوگا تو ہماری بے نیازی اور بے عملی تمام صلاحیتوں کا خاتمہ کر دے گی۔

افسانہ ''مہمان'' کہانی ایک معصوم اور کم عمر لڑکی کے کردار کی معصومیت اور اس کی محنت لگن اور گھٹن کی تصویر پیش کرتی ہے پھر اس کی جذباتیت کو عملی زندگی سے قریب کر کے

حالات سے مقابلہ کرنے کی اس میں بہت ہمت پیدا کی ہے۔

غرض ترنم ریاض کا فن اور ان کی فکر دونوں ہی افسانے میں زندگی کی حقیقت کو تلاش کیا ہے۔ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی' کی کہانیوں کو پڑھ کر یہ انداز ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے حالات کے دباو کو ساتھ لے کر آج کی ہنگامی زندگی سے نپٹنے کی کوشش کی ہے۔

عبدالمنان طرزی نے ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی کی تعریف شاعرانہ انداز میں کی ہے:۔

لوٹ آئیں گی ابابیلیں ترنم کی کتاب
دیکھئے ہیں احساس کی آنکھوں نے جو اکیس خواب
آرزو کس کی نہیں کہ صحرا بن جائے چمن
پر قبائے آتشیں سے جل گئے کتنے بدن
آگ ہو گلزار ہاں اس کی دعا کرتے رہیں
مانگتے وہ عزم کہ شعلوں پر بھی چلتے رہیں
ہے اُسی اِک عزم کی لائی ہوئی فصل قلم
لب میں جن سے متبسم جن سے ہیں آنکھیں بھی نم
''عکس آدھے چاند کا ،'' مہمان ، '' مٹی ، '' باپ ، بھی
پھول بابل مائیں اماں شہر ہو کہ شیرنی
''پوتھی پڑھ پڑھ '' شام جی اور پھر بجھایئے نہ بنیے ''

''برف گرنے والی'' گم گشتہ ۔ متاع ' بھی دیکھئے
اچھی صورت کیا '' آماں '' ایجاد کی مان بھی لکھا
آیا گھر ، برآمدہ '' اور آبلو ں پر بھی حنا
اُن کے افسانوں کے عنوان ہیں اس انداز کے
سازِ دِل اُن کے لیے یا خود ہیں یہ اُن کے لیے
وہ زبان کی تاز گی ہے اور ہے دلکش بیاں
لائی ہیں وہ کشمیر سے جیسے وہ کشت ِ زعفران
زندگی کا بوجھ ڈھونڈنے والے کچھ مزدور بھی
گلشن ہستی میں پیدا کر گئے ہیں تازگی
فصل گل میں سب کا حصہ ہو ضروری تو نہیں
کچھ تو ہوں ایسے بھی جو کھاتے رہیں زخم یقیں
شرحِ زخم زندگی کچے ترنم ۔ جس قدر
پڑھئے اناالله کہ بیمار خود ہے چارہ گر
ہ٥

☆☆☆

حواشی

۱؎ ’’ابابیلیں لوٹ آئیں گی‘‘ مصنف ترنم ریاض ص نمبر ۹ موڈرن پبلشنگ ہاوس دریا گنج نئی دہلی۔

۲؎ ناول مورتی، ترنم ریاض ص نمبر ۹ پبلشنگ ہاوس نئی دہلی۔

۳؎ ایضا، ص نمبر ۸۔

۴؎ ’’ابابیلیں لوٹ آئیں گئ‘‘ ت۔ ر، ص نمبر ۱۰ پبلشنگ ہاوس دریا گنج نئی دہلی۔

۵؎ ناول مورتی، مشاہیر کے سوچ میں، ص نمبر ۱۰۴ پبلشنگ ہاوس نئی دہلی۔

باب ''دوم''

۱۔ الف ادب کی تفہیم، نفسیات کی تفہیم

۲۔ ب ادب اور نفسیات کا رشتہ

ادب کی تفہیم

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روزمرہ کے خیالات سے بہتر خیالات اور روزمرہ کی زبان سے بہتر زبان کا اظہار ہوتا ہے ادب انسانی زندگی کا نچوڑ پیش کرتا ہے کیونکہ انسان دنیا میں جو دیکھتا ہے، جو تجربے حاصل کرتا ہے، سوچتا اور سمجھتا ہے اُس کا اظہار وہ ادب کی شکل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب انسانی زندگی کے وسیع ترین لمحات کا احاطہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔

جہاں تک ادب کے لغوی معنی کا تعلق ہے ادب کے لغوی معنی ''ہر چیز کی حد کو نگاہ رکھنا ،تہذیب ،شائستگی ،تمیز،احترام، پسندیدہ طریقہ اور زبان کا سرمایہ۔ یا ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کو نکھار سنوار پر لکھنا، بولنا ادب ہے۔ اس نکھار سنوار کو ہم جمالیات کا نام دے سکتے ہیں۔ اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ادب کیا ہے؟ اور بہت سے مصنفین نے ادب کو زندگی کے اظہار کا نام دیا ہے۔ ادب چونکہ ایسے لفظوں کی ترتیب و تنظیم کے طور پر سامنے آتا ہے جس میں تکرار اور ماضی حال اور مستقبل میں ترجمانی کے اوصاف پائے جائیں اور جو کسی قسم کی تبدیلی قبول نہ کرے۔ یعنی تبدیلی سے اس کی پُرکشش ہیت میں تخریب کا یا تبنیخ کا احساس اجاگر ہو۔ مثال کے طور پر اُردو کے مقبول ترین افسانے اور شاعری جن کے خاص سانچوں میں ڈھلے ہوئے یعنی الفاظ کے خصوصی ترتیب کے اپنا لینے سے انفرادی مفاہمت ومزاہمت کا ظاہر ہونا خاص جملوں کا شاعری یا نثر کا احساس دلانا۔ ان جملوں کو فن پاروں کی معراج کا شرف عطا کرتا

ہے اور ان لفظوں میں جذبہ وفکر بھی شامل ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعے جذبے، احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی تعریف ہے جس میں کم وبیش ہر وہ بات جس سے کسی جذبے احساس یا فکر کا اظہار ہوتا ہے اور جو منہ یا قلم سے نکلے لوک ادب یا ادب کہلائیگی۔

یہاں پھر سے سوال اور سوال کی تہہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ ادب میں کوئی مقصد ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر ادب میں کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے؟ سوال جتنا اہم ہے اتنا ہی گمراہ کن ہے اگر ادب کو بالکل زندگی کا مترادف مان لیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ خود زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یعنی انسان کی زندگی میں ارتقاء ایک لامحدود تصور ہے۔ تبھی کہا گیا ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہے گا۔ اگرچہ روٹی کے بغیر بھی زندہ رہنا ناممکن ہے تو مارکس اس بارے میں ایک جگہ لکھتا ہے:

''ایک انشاء پرداز کو زندہ رہنے اور اپنے کو لکھنے کے قابل بنائے
رکھنے کے لیے یقیناً روٹی کمانا ہے۔''

لیکن صرف روٹی کمانے کیلیے اس کو زندہ رکھنا اور لکھنا نہیں چاہیئے۔ غرض انسانی زندگی کی طرح ادب کا مقصد بھی سمت اور تنوع Dimension and variety دونوں اعتبار سے لا امتناہی ہی ہے۔

ادب چونکہ سماجی رشتوں کو قائم رکھتا ہے اور یہ زبان کے بہترین استعمال کا اچھا آلہ ہے ادب کا زبان سے چونکہ زندہ تعلق ہوتا ہے اس لئے عظیم ادب کے لیے عظیم زبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے زبان ترقی کرتی جاتی ہے ادب بھی ترقی کرتا جاتا ہے اور یہاں

تک کہ دونوں ایک دوسرے کو آگے بڑھاتے ہیں۔

فرانسی زبان میں ادب کیلئے Belleletters '' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔جس کے معنی ہیں ''حسین تحریر''،تو واقعی ادب حسین تحریروں کا جیتا جاگتا مرقع ہوتا ہے اور وہ اپنے عہد کی سچی روح کو محفوظ کرتا ہے۔اس میں اس کی سماجی ،سیاسی اور معاشی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔گویا زندگی اپنی گونا گوں خصوصیات کے ساتھ ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

ادب ایسی تحریر کو کہا جا سکتا ہے جس میں الفاظ اس ترتیب و منظّم طریقہ سے استعمال کئے گئے ہوں کہ قاری اس تحریر سے لطف اندوز ہو جائے۔اور اس کے معنی سے مسرت حاصل کرے۔مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ سے معنی و مفاہیم اس طرح ظاہر ہوں کہ ان میں مٹھاس (رس) پیدا ہو گیا ہو اور یہی مٹھاس یعنی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔لیکن اس مسرت اور لطف اندوزی کا تعلق ہمارے باطن میں چھپئے ہوئے اس احساس سے ہوگا جس کو اس تحریر میں پا کر ہم مسرت محسوس کر رہے ہیں۔یہ وہ تحریر ہوگی جس نے ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں کے خزانے میں اضافہ کیا ہے۔اور ساتھ ہی ہمارے تجربات وشعور میں احساسِ مسرت کے ساتھ اضافہ کرتے ہیں

جس تحریر میں بیک وقت یہ سب خصوصیات ہوں گی وہ تحریر اسی اعتبار سے عظیم ادب کے ذیل میں آئے گی۔ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہو اور اسی لیے ادب زندگی کے شعور کا نام ہے یہاں پھر سے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ ادب کا وجود دنیا میں کیوں ہوا؟ تو اس وقت صرف یہ سوال اُٹھتا ہے یعنی ''ادب کا انسان کی زندگی سے کیا واسطہ ہے؟ کیوں کہ ادب کوئی راہب یا جوگی نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔

ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہئیت ، اجتماعی ایک خاص نظامِ تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی دوسرا فرد، اورادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اُسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات وسکنات ۔غرض ادب کا مُقصد لطف اور لذت فراہم کرنا نہیں بلکہ انسان کی اصلاح اور ترتیب کرنا ہے ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تخیل اور جذبات ہوں، ورنہ پھر ہر تحریری کارنامہ ادب کہلا سکتا ہے۔ڈاکٹر سید عابد حُسین نے سچے ادب کی تعریف کرتے ہوئے صحیح کہا ہے:

> ''ادب، شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات
> کا نام ہے۔ جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں۔ زندگی کی آنچ
> میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن
> جاتے ہیں''

انسان سماج کی تشکیل کرتا ہے اور اس کی ذات کے تمام مظاہر اور سماج کی ہیئت، اس کی ترقی وتنزل سے متاثر ہوتے ہیں اس لحاظ سے ایسے ادب کی تخلیق کرتے ہیں جس میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے جس سے ان کے تعلقات اور ان کی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے۔اس طرح جب کسی ادیب یا شاعر کو کسی مخصوص نوع ادب سے دلچسپی ہوتی ہے تو وہ اپنے خیالات اسی میں بہتر طریقے سے ادا کرتا ہے۔یعنی انسان کی زندگی کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔اس بارے میں اطہر پرویز نے اپنی کتاب ''ادب کا مطالعہ'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''انسان کی زندگی کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔
> محلوں سے جھونپڑوں تک، بازاروں سے دفتروں تک غرض
> زندگی کا ہر پہلو ادب کا موضوع بن سکتا ہے۔ادب، افراد

اورقوموں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔تجربات دراصل مردہ
واقعات ہوتے ہیں جودھبوں کی طرح انسان کے ذہن میں
پڑے رہتے ہیں۔ادب ان میں زندگی عطا کرتا ہے۔'' ۱؎

انسان کوفطرت سے بہت قدیم اور گہرا رشتہ ہے۔ترقی یافتہ زندگی میں سانس لینے کے باوجود بھی انسان فطرت کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے اور اسی وجہ سے وہ فطرت سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔اوراس تاثیر کا جذباتی اظہار ادب کا موضوع ہوتا ہے اور تخلیق کا یہی جذبہ جب الفاظ کی شکل میں ڈھلتا ہے تو اسے ادب کہتے ہیں یعنی انسانی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ادب انسانیت کا دماغ اوراس کا ضمیر ہے بقول پروفیسر آل احمد سرور:

''ادب چونکہ زندگی کی سچائیوں سے گریز کرہی نہیں سکتا۔
اس لئے غیر شعوری طور پر سماجی بے انصافیوں،اہل ودل
کی چیرہ دستیواورایک عام انسان دوستی اور دنیا کی عظمت اور
رنگ رنگی کوبھی اپنے نالہ ونغمہ میں محفوظ کرلیتا ہے۔'' ۲؎

غرض ادب کوزندگی سے علحیدہ نہیں کیا جاسکتا۔کیونکہ جیسی زندگی ویسا ہی ادب ہوگا۔اور اگرایسانہیں ہے تو ادب اپنے منصب کا بھولا ہوا ہے اور زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے۔کیونکہ ادب انسان کے بہترین خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور انسان کے جذبات و خیالات خلاء میں نہیں پیدا ہوتے بلکہ ایک خاص تہذیب اورایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔توعلمی لحاظ سے ادب کی تعریف اس طرح ہیں کہ وہ حسنِ کلام اورتاثیرِ کلام کا نام ہے جو

چیز ادب کو عام انسانی گفتگوؤں اورتقریروں سے ممیّز کرتی ہے۔وہ کلام کا حُسن اور تاثیر ہے
جب انسان اپنی بات کو خوبصورت طریقے سے ادا کرتا ہے اور اتنے موثر طریقے سے ادا کرتا
ہے کہ سننے والا اثر قبول کرے۔اور جو کچھ بات کرنے والا چاہتا ہے وہ اثر ڈال سکے۔اس
نوعیت کے کلام کو ہم ادب کہتے ہیں۔ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں
۔کیونکہ ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہے۔اور اسی لیے ادب زندگی کے شعور کا
نام بھی ہے۔کیونکہ شعور سے ہی ہمارے اندر قوتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔زندگی کے ایسے تجربے
جن سے ہمیں کبھی واسطہ نہیں پڑا اور ادب کے ذریعے براہ راست ہمارے تجربے بن جاتے
ہیں اور ہمیں اور ہمارے اندازِ فکر کو بدل دیتے ہیں۔ادب آزادی کی روح کا اظہار ہے ادب
سچائی کی تلاش کا موئثر ذریعہ ہے۔ادب جن دنیاؤں میں ہمیں لے جاتا ہے،وہ حقیقی ہوتی
ہے۔جمیل جالبی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

''ہماری اصل زندگی ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔
ادب کا کام یہ ہے کہ وہ اسے ہمارے سامنے لے آئے اور
اس طرح ہمیں خود ہم سے واقف کرادے۔گویا ہم نے
نیا جنم لیا ہے۔'' ۳؎

الغرض ادب آرٹ کی ایک شاخ ہے جسے ''فنِ لطیف'' بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہاں پر یہ سوال
اُٹھتا ہے کہ آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین
فکریات (Ideology) یعنی اجتماعی خیالات و افکار کا حامل نہیں ہے تو وہ صحیح معنوں میں
ادب نہیں ہے۔اب یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ حسن خیر اور حقیقت،تینوں کو ایک آہنگ بنا کر

پیش کرنے کا نام ادب ہے اور سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو بیک وقت ہمارے ذوقِ فکر اور ذوقِ عمل کو نہ صرف آسودہ کرے بلکہ حرکت میں لائے۔ کیونکہ اب خیال حُسن اور عمل حسن کا جولی دامن کا ساتھ ہے۔ حالانکہ ادب انسان کے جذبات وخیالات کا ترجمان ہے اور انسان کے جذبات وخیالات تابع ہوتے ہیں۔ زمانے اور ماحول کے جیسا دور اور جیسی معاشرت ہوگی ویسے ہی جذبات وخیالات ہوں گئے اور پھر ویسا ہی ادب ہوگا۔

ادب کی مختلف ناقدین نے مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ابنِ خلدون نے ادب کو علم قرار دیا ہے۔ ادب وہ فنِ لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب اپنے جذبات وافکار کو اپنے نفسیاتی وشخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے ذریعے سے زندگی کے داخلی وخارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے تخیل سے کام لے کر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے کہ سامع وقاری کا جذبہ وتخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوتا ہے۔

ادب کو زندگی کا مظہر اور حیات کی تفسیر کہا گیا ہے۔ جو نیرنگ زمانہ کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز ہمیشہ بدلتی رہتی ہو اس کی پرکھ کے اصول بھی سخت اور بے لچک نہیں ہو سکتے۔

ادب کی تعریف کے سلسلے میں ناقدین میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے مختصراً اس کی کوئی تعریف کرنا آسان نہیں ہے۔ شیخ یونس نے ادب کو غلطیوں سے بچنے کا ایک ذریعہ بتایا ہے۔ جبکہ میتھو آرنلڈ کے نزدیک وہ تمام علم جو کتب کے ذریعے ہم تک پہنچائے ادب کہلاتا ہے۔ کارڈ ڈینل نیومین کہتا ہے۔ ''انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے ادب کہلاتا ہے۔'' نارمن جودک کہتا ہے۔ ''ادب مراد ہے اس مقام

سرمایہ خیالات واحساسات سے جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔''

ابنِ خلدون نے اپنی کتاب کے مقدمے میں ادب کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:۔

''اُدباء نے ادب کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے کہ ادب
نام ہے اشعار، واخبار عرب کے یاد کر لینے کا اور ساتھ ساتھ
ہر علم سے ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے۔یعنی علوم لسانیہ
سے بھی اور علوم شرعیہ سے بھی۔۔۔متقدمین کے نزدیک ادب
کی پوری تعریف یہی ہے متاخرین البتہ اصطلاحات، صنائع
بدائع مع سند یاد کرنے کو ادب کی تعریف میں داخل کرتے ہیں۔'' ۴ے

غرض ادب کی تعریف میں پہلی بار علومَ لسانیہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ابنِ خلدون کے یہاں ہی ملتا ہے۔ یہاں پر یہ بات واضح ہے کہ ابنِ خلدون نے ادب کی تعریف کی ہے جبکہ اس سے قبل کوئی واضح تعریف ادب کی نہیں ملتی۔اب یہاں پر پھر سے سوال اُلجھ گیا کہ ادب کیا ہے اور کون سی چیز ادب نہیں ہے۔انہی سوالوں کا جواب دیتے ہوئے ویرنؔ اور ویلک نے لکھا ہے:

''ایک نظریئے کے مطابق ہر مطبوعہ چیز ادب ہو سکتی ہے۔
ایڈورڈ گرین لا کا خیال ہے کہ ہر وہ چیز جس کا انسانی تہذیب

کی تاریخ سے کوئی بھی تعلق ہے ادب میں شامل ہو سکتی ہے۔
کسی بھی دور کی تاریخ کو سمجھنے کیلئے ہم محض اس دور کی ادبی
کاوشوں یا مطبوعہ مسودات تک ہی محدود نہیں رہ سکتے۔ لازم ہے
کہ ہم ادبی تخلیق کو اس روشنی میں دیکھیں کہ یہ تہذیب کی تاریخ
میں کیا ممکن رول ادا کرتی ہے۔ گرین لا کے اس نظریئے اور
دوسرے محققوں کے اس پر عمل کے مطابق ادبی مطالعے کا
نہ صرف تاریخ اور تہذیب سے ایک اہم رشتہ پیدا ہو جاتا ہے بلکہ
یہ دونوں تقریباً ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا مطالعہ اس
لئے ادبی ہے یہ ان مطبوعہ یا قلمی نسخوں پر غور کرتا ہے جو کہ لازماً
تاریخ کا بھی ایک اہم منبع ہیں۔'' ؎۵

اسی طرح ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ادب کی ایک جامع تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ادب ایک فنِ لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے
اس کا مقصد اظہار و ترجمانی و تنقید ہے اس کا سرچشمہ
تحریک حساس ہے اس کا معاون اظہارِ خیال اور قوتِ مخترعہ
ہے۔ اور اس کے خاجی روپ وہ حسین ہیئت اور وہ خوبصورت
پیرائیہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریک کی صورت
اختیار کرتے ہیں۔'' ؎٦

غرض ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات واحساسات

کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔اصل میں ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ جو خارجی حقیقتوں کو داخلی آیئنے میں پیش کرتا ہے ادب انسانی زندگی کا ترجمان اور نقاد ہوتا ہے۔جسکی وجہ سے بہترین ادب میں سماجی، ثقافتی، فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کا ہونا ادب میں لازمی ہے کیونکہ یہی چیزیں ادب کو زندگی سے ہم اہنگ کرتی ہیں۔ادب زندگی اور اس کے تجربات کو سمجھنے کا شعور بخشتا ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ نئے تجربات کے لیے اہم معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ پھر بھی بہترین ادب کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اجتماعی خواہشات کی تکمیل کرے۔ ہر شخص کو اس کے ذوقی اور معیار کے مطابق ذہنی سکون بہم پہنچائے اور اچھے خیالات وصحت بخش تصورات پیش کرے۔اور یہ بات اسی وقت ہوسکتی ہے جب ادب اپنے سماجی ماحول، تہذیبی، اخلاقی اور معاشرتی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ کیونکہ ادب کو نظامِ زندگی سے گہرا تعلق ہے۔حالانکہ ادب انسانی تجربات کو ظاہر کرنے کا نام ہے۔تو تجربات انسان کے ماحول سماج بلکہ پوری کائنات سے وابستہ ہوتے ہیں۔اس لئے اس کی تخلیق بھی یقینی طور پر منظّم عمل کہلائے گئی۔ کیونکہ اس میں اجتماعی تجربات ہوں گے اور اس کا اثر سماج اور ماحول پر اجتماعی شکل میں پڑے گا۔

غرض ادب ایک چمکتا ہوا سورج ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں کا ہونا ضروری ہیں۔بعض اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہوجاتے ہیں لیکن سچا اور پائدار ادب وہی ہے جس میں حرارت بھی ہو ورنہ خالی چمک دمک چاند کی روشنی کی طرح محض خالی اور شرارہ کی چمک کی طرح وقتی ہوتی ہے۔ یہاں حرارت کا تعلق ادیب کے دل و دماغ سے ہے، جبکہ چمک کا تعلق اس کے فن سے۔

مجموعی طور پر مختصراًالفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ فطرت اور بشری سماج کے گزرتے ہوئے لمحوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو جداگانہ زاویوں سے اخذ کر کے الفاظ کا جامعہ پہنا کر تاریخ کا حصہ بناتے ہوئے تجدید کی گنجائش کے ساتھ آئینہ تیار کر دینا، کہ جس میں حسبِ ضرورت قاری اور سامع اپنی فہم وفراست کے مطابق اپنے تجربے اور مشاہدے کو اس آئینے میں دیکھ اور پرکھ لے۔ یہ ادب کہلائے گا۔ وہاں اس کے اظہار کے لیے رنگوں کا استعمال کیا جائے۔ کسی بھی زبان کے الفاظ کے یعنی کسی بھی قسم کی تحریر کو بروئے کار لایا جائے یا زبانی اظہار کیلئے عملی طور پر نقالی کی صورت میں پیش کیا جائے۔

نفسیات

ہم جانتے ہیں کہ انسان میں فطری طور پر اپنے آپ کو ہر ماحول میں ڈھالنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے انسان کے برتاو میں لگاتار تبدلیاں ہوتی رہتی ہے۔ برتاوء کی ان تبدیلیوں کی وجہ معلوم کرنا نفسیات کا کام ہے۔ نفسیات علم کی وہ شاخ ہے جو ہمیں انسان کے کردار اور اس میں تبدیلیوں کی وجوہات کا علم فراہم کرتی ہے۔ جبکہ ذہن اور رویوں کے مطالعے کو علم نفسیات' کہتے ہیں یہ ایک ایسا منظّم مضمون اور اطلاقی سائنس ہے۔ جو کہ عام اصولوں اور مخصوص معاملات پر تحقیق کے ذریعے افراد اور گروہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے

نفسیات کا لفظ دو الفاظ ''روح'' اور'' مطالعہ'' سے مل کر بنا ہے۔ جس کا مطلب ہوا'' روح کا مطالعہ کرنا'' نفسیات انسان کے کرداد اور روح کا مطالعہ کرنے میں مددگار

ثابت ہوتی ہے۔ 'نفسیات' ایک علم ہے۔ جو کہ زندگی کے تمام شعبہ جات میں استعمال ہوتا ہے۔اور جس کی ابتدا اس وقت سے ہے۔ جب سے انسان کا وجود ہوا ہے۔ یہ روح کا علم بھی ہے، اور کردار و تجربہ کا بھی اب تو نفسیات ایک سائنسی علم کا درجہ سے جانی جاتی ہے۔جبکہ یہ تجربات بھی کرتی ہے۔ یہ علم ہر جگہ موجود ہے، سکولوں میں، کالجوں میں، گھریلو زندگی میں، سماجی زندگیوں میں اور اداروں میں۔غرض ہر جگہ جہاں جہاں انسان موجود ہیں۔ وہاں علم نفسیات موجود ہے۔

مختلف ماہرین نے نفسیات کی تعریفیں اس طرح بیان کی ہے۔ رابرٹ ایس وارڈس وریتھ R.S. Words Worth ''نفسیات فرد کی ان عملی سرگرمیوں کا علم ہے جو وہ اپنے ماحول کے مطابق کرتا ہے''

سی ای اسکز، ''نفسیات فرد کے اس برتاو کا علم ہے جو وہ اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے''

ٹی پی ٹن، ''نفسیات ایسے رویہ اور تجروبہ کا ایک مثبت علم ہے جو تجروبہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے''۔

گارڑنر مرفی، ''نفسیات وہ علم ہے جو کسی فرد پر ماحول کے اثرات کے ردعمل کا مطالعہ کرتا ہے''۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انسان کے برتاو کا علم ہی علم نفسیات ہے اس طرح علم نفسیات ہمیں بتا تا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے ماحول میں کس طرح ڈھالتا ہے اس کا جو بھی عمل ہے اس کی وجہ کیا ہے کیونکہ انسان کے مزاج اور برتاو اور

رویوں کے بارے میں معلومات ہمیں انسان کی نفسیات کے مطالعہ سے ہی ہوتی ہے۔

اب نیے علوم اور جدید سائنس نے عجیب رازوں کے چہروں سے نقاب ہٹائی ہے۔ ان میں سے ایک راز یہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر بہت سی انجانی دنیائیں آباد ہیں۔ ہم جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں اس میں ان دنیاؤں کا عکس بہرطور پر نظر آتا ہے۔ جو علم ہمارے ذہن کے ان تہ خانوں میں گُس کر سراغ رسانی یا جاسوسی کا کام کرتا ہے اسے انسانی نفسیات کا علم کہتے ہیں۔ یہ علم ان باتوں سے سروکار رکھتا ہے۔ کہ انسان کس طرح سوچتا ہے، کس طرح محسوس کرتا ہے، اور کس موقع پر اس کے کیا جذبات ہوتے ہیں۔ نفسیاتی تنقید زیادہ قدیم نہیں ہے۔ لیکن تحلیل نفسی میں انسانی سوچ کا رخ بدل کر رکھ دیا اور مذہب، معاشرہ، اخلاق اور جمالیات کے اصولوں میں انقلاب پیدا کر دیا، اور نفسیاتی تنقید بھی اصناف ادب اور تخلیقی سانچوں میں بنیادی تبدیلی کا باعث بن گئی۔

نفسیات Psychology بنیادی طور پر رویئے Behaviour اور عقلی ندگی کے سائنسی مطالعے Scientific Study کو کہا جاتا ہے۔ چونکہ بات یہاں صرف عقل اور اس کے حیاتیاتی افعال انجام دینے کی نہیں، بلکہ عقلی زندگی کی ہے۔ یعنی جسمانی اور عقلی کا مجموعہ۔ اس لیے نفسیات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں، کہ نفسیات دراصل نفس ''Soul'' کے مطالعے کا نام ہے اور اسی لیے اسکو نفسیات کہا جاتا ہے۔ یعنی ''نفس کا مطا''لعہ انگریزی میں اسکو Psychology کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ Psyche تو نفس کو کہتے ہیں۔ اور Logy مطالعہ کو اور یہ ان دو کا یعنی Psyche & Logy کا مرکب لفظ ہے۔

علم نفسیات (Psychology) میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم میں

تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔سائیلولوجی کی اصطلاح یونانی زبان سے ماخذ ہے۔یہ دولفظوں کا مرکب Psycheیعنی'' روح''اورLogos بہ معنی ''علم'' اسطرح مرکب لفظ سائیکولوجی کے معنی ہوئے'' روح کا مطالعہ'' اسی لحاظ سے اُردو میں اسکونفسیات کا نام دیا گیا ہے۔جس کا مطلب ہوا ''نفس کا مطالعہ'' لیکن روح کے وجود اور ماہیت کے بارے میں اطمینان بخش ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے بعد کے زمانے میں نفسیات کوانسانی دماغ کے مطالعے یاStudy'' of Mind سے متعلق علم مانا گیا۔لیکن دماغ'Mind ' بھی روح کی طرح ایک ایسا مفروضہ ہے، جس کے وجود اور ماہیت کے بارے میں مکمل ثبوت نہں پیش کیے جاسکتے۔اس لئے سائنسی اعتبار سے یہ تعریف بھی مناسب نہ سمجھی گئی چونکہ سائنس کی کسوٹی پر وہی چیزیں قابل قبول سمجھی جاسکتی ہیں۔جن کا مشاہدہ کیا جاسکتا یا جانچا اور پرجاسکتا ہے۔اس لیے نفسیات کی یہ تعریف بھی ترک کرنا پڑی اورStudy Of Mind کے بجائے اسکومطالعہ شعور Study Of Consciousness قرار دیا گیا۔لیکن اس طرح نفسیات کا دائرہ محض ان انسانی افعال یا تجربات تک ہی محدود رہ گیا، جو ہمارے شعور میں ہیں۔یا جن کا ہمیں شعوری احساس ہے۔نیند، بیہوشی اور دوسری بہت سی غیر شعوری 'Involuntary' اور لاشعوری 'Unconscious'حالتیں اورافعال جیسے بھولنا، خواب، اضطراری حرکاتReflex Action دیوانگی وغیرہ اس دائرے میں نہ آسکتے تھے۔ویسے بھی یہ ایک حقیقت ہے۔کہ عام انسانی زندگی میں لاشعوری محرکاتDrives کا شعور بھی زیادا اہم حصہ ہے۔ہمارے بیشتر افعال Actions کردار Behaviour اور شخصیتPersonality بڑی حد تک لاشعوری کیفیات سے متاثر ہوتے ہیں۔

غرض جدید دور کے ماہرین نفسیات نے اس کو مطالعہ انسانی کردار Study Of Human Behaviour کی حیثیت سے پیش کیا۔ نفسیات کی اس تعریف میں انسانی کردار Behaviour کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ اسمیں شعوری Conscious اور غیر شعوری Unconscious حالتیں اور افعال دونوں شامل ہیں۔ کردار Behaviour سے محض ظاہری اور نظر آنے والے افعال ہی مراد نہیں۔ بلکہ اندرونی حالتیں بھی ہیں۔ جیسے سوچنا، غور کرنا، تصور کرنا وغیرہ۔ تو دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے کہ نفسیات ایک سائنس ہے، جو انسانوں کا اور اسکے کردار کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کے دائرے میں کردار کی ظاہری اور باطنی، شعوری اور غیر شعوری تمام حالتیں شامل ہے۔

غرض نفسیات کے دائرے میں وہ تمام مسائل آجاتے ہیں۔ جن کا تعلق انسانی شخصیت، کردار اور انسانی زندگی سے ہے۔ نفسیات انسانی شخصیت کو سمجھنے کیلئے انسان کی پیدائش سے ماحول تک کے اثرات کا جائزہ لیتی ہے۔ جس میں ان کے جذبات Emotions احساسات Sensations مشاہدات Obeservations یا محرکات Drives کو سمجھیں جو کسی فعل کے پس منظر میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ نفسیات کے مطالعے کے اہم پہلو ہیں۔

نفسیات کو انسانی کردار Behaviour کے مطالعے کی سائنس کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ نفسیات بھی سائنس کے طریقوں کو اپنائے۔ سائنس کی طرح نفسیات بھی مشاہدہ Observation اور تجربے Experiments کے ذریعے حقائق Facts کو باقاعدہ اور ضبط و نظم کے ساتھ جمع کرتی ہے۔ ان کا تجزیہ کرتی ہے، اور نتائج Results اخذ کرتی ہے، اور ان نتائج کی مدد سے عام نظریات یا اصول پیش کرتی ہے۔

علم نفسیات کا ارتقاء:۔

سائنس اور ٹکنالوجی نے تو صرف انسان کے مادی وجود کا شیرازہ بکھیرا تھا، لیکن ایک آدھ صدی بعد اس سے بھی بڑا حادثہ ہوا، جس نے انسان کے نفسیاتی وجود جس کو ہم عام طور پر روحانی وجود کہتے ہیں پر کاری ضرب لگائی یہ حادثہ علم نفسیات کا ارتقاء تھا۔اس علم نے بڑے دلائل کے ساتھ اس بات کو پیش کیا کہ آدمی کا نفسیاتی وجود بھی ایک خرابے کی مانند ہے۔ اور وہ نظم وضبط سے عاری ہے۔اور آگر چہ اس میں نظم وضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ پر زندگی جینے کا یہ انداز فطری نہیں رہتا۔ولیم جیمز William James کو علم نفسیات کا موجد مانا جاتا ہے۔ اور علم نفسیات کے ارتقاء کا سہرا اُسی کے سر باندھا جاتا ہے۔کیوں کہ اُسی نے 'اُصول نفسیات' لکھ کر اس علم کی داغ بیل ڈالی، اس کے بعد جتنے بھی ماہرین نفسیات پیدا ہوئے۔سب نے اُسی کے نظریات کو اساسی اہمیت دے کر نئی عمارتیں کھڑی کیں۔علم نفسیات اور نفسیاتی تنقید کا با قاعدہ اور باضابطہ رواج فرائیڈ کے وقت سے ہوتا ہے۔

لیکن سلیم اختر کی رائے ہے۔کہ دیگر نفسیاتی نقادوں کے مقابلے میں کولرج میں زیادہ گہرائی نظر آتی ہے۔اسے فلسفہ کا دیا ہوا شعور تھا۔فلسفہ نے اس کے تحلیلی ذہن کو مزید جلا بخشی اور یوں جدید نفسیات سے کہیں پہلے اس نے آج کے نفسیاتی ادبی مباحث کی داغ بیل ڈالی حالانکہ تخیل پر اس نے جو کچھ لکھا وہ آج کے کسی نفسیات دان کے قلم سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ رومانی تنقید کا علمبردار تھا۔مگر ٹی۔ایس ایلیٹ T.S.Elit اور ہربرٹ ریڈ نے The True Voice Of Feeling میں اسے پہلا نفسیاتی نقاد قرار دیتے ہیں اتنا

ہی نہیں بلکہ ہربرٹ ریڈ کے خیال میں تو کولرج پہلا نفسیاتی نقاد ہی نہیں بلکہ ادبی تنقید میں لفظ Psychology بھی پہلے اسی نے استعمال کیا اوراسی نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا کہ تخیل کا سرچشمہ لاشعور سے پھوٹتا ہے۔جیسا کہ ہم پہلے ہی یہ جان چکے ہیں۔ کہ نفسیاتی تنقید کی باضابطہ ابتداء فرایئڈ کے نظریہ نفسیات کی اشاعت کے بعد ہوئی۔ فرایئڈ انسانی نفسیات کا ایک ماہر ڈاکٹر تھا اس کے دوشاگرد الفریئڈ ایڈلر Alfred Adler اور یونگ نے بھی نفسیاتی معاملات پر قلم اُٹھایا۔اور علم نفسیات کے ماہرین علما میں تین ناموں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔فرایئڈ نے اپنے کئی نظریے پیش کیے ہیں۔جن میں 'نظریہ تحلیل نفسی' اور 'نظریہ جبلت' کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اڈلر کے 'نظریہ کو نظریہ احساس کمتری' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے تیسرے شاگرد یونگ کے نظریہ کو 'اجتماعی لاشعور' کا نام دیا گیا ہے۔

تحلیل نفسی کا نظریہ

فرایئڈ تحلیل نفسی کے نظریے کا موجد ہے۔تحلیل نفسی کا مطلب ہے ''ذہن کی تہہ میں چھپی ہوئی باتوں کا پتہ لگانا'' یہ ایک ایسا علم ہے۔جس کے ذریعے انسانی ذہن ودماغ کے پیچ وخم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔تحلیل نفسی ایک جدید نفسیاتی علم ہے۔ یہ دماغی تجزیہ اور نیوراتیت [Neurosis] کے علاج کا نام ہے۔کہتے ہیں کہ فرائیڈ نے سب سے پہلے ۱۸۸۱ء میں ہسٹریا کی ایک بیمار عورت کا علاج تحلیل نفسی کے ذریعے شروع کیا تھا۔اور بعد

میں جیسے جیسے فرائیڈ کا یہ علم لوگوں میں بڑھتا گیا۔جبکہ ادب اورادیب کے بارے میں بھی انہی طریقوں کو استعمال کیا جانے لگا اوتحلیلی نفسی کی دریافت ادبی تنقید میں اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔ غرض تحلیل نفسی انسان کی انفرادی زندگی کے مدفون حالات اور پیچیدگی [Complexes] کی تلاش کا نام ہے۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ انسان بچپن سے اپنی جنسی خواہشات کودباتا رہتا ہے۔جو کہ لاشعور میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔اس نظریے کے مطابق بچہ سب سے پہلے ماں اور باپ کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے۔جس کوفرائیڈ نے اُوڈی پس کمپلکس Oedi Pus Complexاور الکٹرا کومپلکسElectra Complex کا نام دیا ہے۔اوڈی پس اُلجھن بچپن سے ہی بیٹے کی ماں کی طرف رغبت اوراس کی غیر معمولی محبت کوظاہر کرتی ہے۔اسی طرح الکٹرا اُلجھن بیٹی کی باپ کی طرف رغبت کا نام ہے۔کہتے ہیں کہ یہ دونوں اصطلات یونانی دیوملا سے لی گئی ہیں۔جو یونان کے دومشہور المیہ ڈراموں سے ماخوذ ہیں۔مگر ادب میں عام اور واضع طور پر الجھنوں کی'اوڈی پس اورالکٹرا الجھنوں کی' مثالیں نظرنہیں آتیں۔تو اُردوادب میں ان کا تلاش کرنا خاص طور سے اورزیادہ دشوار ہوگا۔

ارونگ ہود کا خیال ہے کہ

"تحلیل نفسی انسانی شخصیت کومتحرک اور موثر انداز میں دیکھتی ہے۔
جواندرونی طور پرایک میدان جنگ کا نقشہ رکھتی ہے۔جس میں
پہچان اور ضبط ونظم خواہش اورروایات میں سخت کشمکش ہوا کرتی ہے۔
یہ نظریہ یقینی طور پرداخلی تحریکات کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔
انیسویں اوربیسویں صدی کی تحریروں میں بہت زیادہ

عام ہے۔ تحلیل نفسی نقاد کو صرف ادب میں لاشعور کی نمائندگی
اور اثرات کی تخلیق سے دوچار نہیں کرتی بلکہ اس طرح مطالعہ
کیلئے ایک بہترین تکنیک فراہم کرتی ہے۔ تحلیل نفسی انسان کی خارجی
باتوں سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔
اور معاشرتی پردوں کے پیچھے انسان کی شخصیت کی تہہ میں حقیقتوں
کی جستجو کرتی ہے۔ جو کہ ہمارے موجودہ ادب سے بہت زیادہ
قریب ہے۔ ۹ے

مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ تحلیل نفسی کے تحت ماہرین نفسیات انسانی ذہنوں کے پوشیدہ رازوں کو فاش کرنے کا کام کرتے ہیں۔ اسے دماغی تجزیے کا علم بھی کہا جاسکتا ہے۔

نظریہ لاشعور اور جبلت

فرائیڈ کا نظریہ لاشعور اور نظریہ جبلت دونوں الگ الگ نظریے نہیں ہیں۔ بلکہ لاشعور ہی کی توسیع اور تشریح کیلئے فرائیڈ نے جبلتوں کا سہارا لیا ہے۔ یہی بعد میں نظریہ جبلت نے بھی ایک واضح فلسفہ کی صورت اختیار کر لی۔ فرائیڈ نے ہمارے ذہن و دماغ کو ایک تہہ خانے کی مانند بتایا۔ جس میں طرح طرح کا سامان محفوظ رہتا ہے۔ دماغ کا ایک حصہ تو وہ ہے۔ جس کے بارے میں انسان خوب جانتے ہیں۔ کہ اس میں کیا کیا موجود ہے۔ اسے شعور کہا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں گھپ اندھیرے ہے۔ اس کے بارے میں خود انسان کو بھی

کچھ خبر نہیں۔فرائیڈ کا کہنا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ایسی چیزیں جمع رہتی ہیں۔جنہیں ہر طرف ناپسند کیا جاتا۔ جیسے جنسی خواہشات ،لالچ ،خود غرضی وغیرہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس طرح کی چیزیں اس اندھیری کوٹھری یعنی لاشعور میں جاچھپتی ہیں۔ذہن کے اس حصے کو ایک طرح کا گودام کہا گیا ہے۔ذہن کے اس حصے کو فرئیڈ نے لاشعور کہا ہے اور ساتھ ہی اس (فرائیڈ) کا خیال ہے کہ انسان کی زندگی میں شعور سے زیاد لاشعور کی کارفرمائی ہوتی ہے۔اور اس کی دنیا شعور کی دنیا سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقت ور ہوتی ہے۔یعنی ہماری وہ خواہشات جو پوری نہیں ہو پاتی اور جن کے ذکر تک کو سماج ناپسند کرتا ہے۔وہ دنیا کے خوف اور بعض پابندیوں کی وجہ سے لاشعور میں جاچھپتی ہیں۔اور انہیں جب بھی موقع ملتا ہے۔وہ شعور کے حصے میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔مگر اس سے پہلے شعور اس موقع پر پولیس کانسٹیبل کا کام کرتا ہے۔اور انہیں پھر لاشعور کے حصے میں ڈھکیل دیتا ہے۔فرائیڈ کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے۔تو اس کے ساتھ اس کا شعور بھی سو جاتا ہے ایسی حالت میں لاشعور کی ان دبی کچلی خواہشوں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔اور یہ خواب کی شکل میں انسانوں کو نظر آتی ہیں۔ شعور اور لاشعور کے درمیان دماغ و ذہن کا ایک تیسرا حصہ بھی ہے۔جس سے ''تحت الشعور'' کہا گیا ہے۔ یہاں وہ چیزیں ہوتی ہیں جنہیں ہم پوری طرح بھولے بھی نہیں اور جو اچھی طرح یاد بھی نہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو دماغ پر زور دینے سے شعور کی سطح پر اُبھر آتی ہیں۔غرض علم نفسیات میں لاشعور کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔لاشعور کی عام طور پر تعریف یہ کی گئی ہے۔کہ ذہن ودماغ کے پیچھے ایک پوری دنیا خیالات ، جذبات، خوف، ہیجانات اور بہت سے احساسات آباد ہے۔جو ہماری خارجی دنیا سے جس کو شعور کہتے ہیں کہیں زیادہ بڑی اور طاقت

ور ہوتے۔ پیکر نے لاشعور کی وضاحت کرتے ہوئے ایک کتاب میں لکھا ہے۔ "نفسیاتی نظریئے کے مطابق ذہن کا ایک حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں ہوتا اور جس کو وہ اپنی کسی بھی کوشش کے ذریعے شعور میں نہیں لاسکتا اس میں جو کچھ بھی ہے۔ وہ نفس ضابطہ کے تحت ابتدائے بچپن سے صدمات، محسوسات، تجربات، خواہشات اور آرزووں کی صورت میں جمع ہوتا گیا"

غرض لاشعور خالص نفسیاتی تصور ہے۔ جس میں فرائیڈ بہت سارے خیالات اور عمل کی تشریح کرنا چاہتا ہے۔ فرائیڈ کے مطابق لاشعور کا اصلی خط اڈ (ID) کہلاتا ہے۔ یہ انسان کی تمام ذہنی قوت کا مرکز ہے جس میں انسان کے تمام جبلی رجحانات جمع رہتے ہیں۔ انسان کی پیدائش کے وقت اس کی ذہنی اور دماغی دنیا صرف جبلتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہ جبلتیں جس جگہ میں جمع رہتی ہیں۔ وہ اڈ کہلاتی ہے۔ اڈ کی توضیع و تشریح کو ہی نظریئہ جبلت کا نام دیا گیا ہے۔

چونکہ جبلت ایک فطری رجحان ہے۔ جب ہمارے جسم میں اچانک ردعمل کی شکل میں جسمانی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو جبلت کہتے ہیں۔ فرائیڈ نے ان جبلتوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا 'حیاتی' اور دوسرا 'مماتی' یعنی بعض جبلتیں زندگی کے مقصد تولید نسل اور تسکین نفس جیسے فرائض کو پورا کرتی ہیں۔ اور بعض انسان کو موت کی طرف لے جاتی ہیں۔ چناچہ انسانی فطرت میں موجود انا (Ego) حیاتی اور فوق الانا (SuperEgo) مماتی جبلت کی نمائندگی کرتی ہے حالانکہ اندرونی دنیا میں اڈ کے علاوہ کوئی دوسرا خط نہیں ہوتا اس لیے

اسی کا ایک حصہ بیرونی دنیا سے وسیلے کا کام کرتا ہے۔جس کو ایگو یا انا کہتے ہیں۔اور ایگو کا ایک حصہ سپر ایگو(Super Ego) یا فوق الانا بن جاتا ہے۔اڈ ایگو اور سپر ایگو(ID,Ego and Super Ego)ہی انسانی ذہن میں توازن اور غیر توازن کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔الغرض فرائیڈ کا نظریہ اور دوسرے نظریات سبھی آپسمیں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔جیسے نظریہ تحلیل نفسی،نظرئیہ جبلت اور نظریہ لاشعور کے مطالعے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سارے نظریے آپس میں تصوارت کی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

اڈلر کا نظرئیہ:

احساس کمتری فرائیڈ کے شاگرد اڈلر کے نظریہ کو نظریہ احساس کمتری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔'احساس کمتری' کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز سے محروم ہو جاتا ہے۔تو وہ دوسروں کے مقابلے میں خود کو حقیر یا کمتر سمجھنے لگتا ہے۔اور یہ احساس شروع سے آخر تک انسان کو گھیرے رہتا ہے۔جیسے کمزور جسم کمزور ذہن۔۔۔ذہن یا صلاحیت و تجربے کی کمی کے سبب یہ شحص دوسروں کا محتاج ہوتا ہے جس کی وجہ سے قدم قدم پر وہ دوسروں کے سہارے اور سماج کی مدد کا محتاج رہتا ہے۔

غرض کہ انسان کو پوری زندگی میں کبھی بھی احساس کمتری سے نجات نہیں ملتی۔اڈلر کے قول کے مطابق جو شحص بھی احساس برتری کا اظہار کرتا ہے۔دراصل اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی احساس کمتری کا جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہے اصلاً احساس برتری ہی اس کے احساس کمتری کا ثبوت پیش کرتا ہے احساس برتری کا تعلق بھی انسان کے ذہن میں پوشیدہ

لاشعور سے ہے۔جس میں احساس کمتری موجود ہوتی ہے۔اڈلر کے مطابق ہر انسان کے اندر احساس کمتری موجود ہوتا ہے۔ اور ہر انسان اپنے احساس کمتری کو الگ الگ طرح سے برداشت کرتا ہے۔جس میں ہر شخص کا ردعمل مختلف ہوتا ہے۔ اور اسی ردعمل سے انسان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے کوئی احساس کمتری پر قابو پانے کے لیے خود کو دوسروں سے برتر ظاہر کر نے کی کوشش کرتا ہے اڈلر کے مطابق برتری کا احساس بھی ایک قسم کا احساس کمتری ہے۔ یوں تو برتری ایک بنیادی خواہش ہے لیکن بعض لوگوں میں یہ ایک بیماری بن جاتی ہے اور تحلیل نفسی نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ انسان میں برتری کا احساس دراصل کسی عیب کو چھپانے کیلیے ہوتا ہے اور احساس کمتری سے چھٹکارا پانے کی دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ انسان خیالی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔یعنی جو چیزیں وہ حقیقت میں نہیں پا سکا۔ اسے فرضی دنیا میں پا لینے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ صورت زیادہ خطرناک ہے اس سے طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیاں اور ذہنی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اڈلر کا یہ بھی خیال ہے کہ انسان اپنی ذہنی یا جسمانی کمزوری کو دور کرنے کے لئے ’’تلافی طریقہ ءکار‘‘ Compensation Method کو اپناتا ہے۔

اجتماعی لاشعور کا نظریہ:۔

فرائیڈ کے دوسرے شاگرد ’’یونگ‘‘ نے نظریۂ ’’اجتماعی لاشعور‘‘ دیا۔ انہوں نے فرائیڈ کے نظریۂ خواب سے اختلاف کرتے ہوئے خواب کو اجتماعی لاشعور کا ایک ایسا عمل بتایا ہے جس پر قدیم نسلی اور دیومالائی اثرات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور انہوں نے اجتماعی لاشعور کو سب سے زیادہ اہمت دی ہے جس کی وجہ سے اس نظریۂ کو ’’اجتماعی لاشعور‘‘ کا نظریہ کہا جاتا ہے۔

اجتماعی لاشعوران تجربات کی اجتماعی یاداشت کو کہتے ہیں۔جن سے عالم انسانیت گزر چکا ہے۔ یہ تجربات انسانی لاشعور میں محفوظ رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کا اظہار ہوتا رہتا ہے یونگ کا خیال ہے کہ اجتماعی لاشعور انجانے طور پر کام کرتا رہتا ہے فرائیڈ نے خواب کو لاشعور میں دبی کچلی خواہشات کا وسیلہ بتایا ہے جبکہ یونگ کے نزدیک انسانی نفس کا ہر فعل و عمل ایک متعین مقصد کا حامل اور آئندہ کی سمت اشارہ کرنے والا ہوتا ہے۔

یونگ نے اپنے لاشعور کو دو حصوں میں تقسیم کیا پہلا انفرادی لاشعور اور دوسرا اجتمائی لاشعور۔ انفرادی لاشعور میں انسان کے انفرادی تجربات و مشاہدات رہتے ہیں جبکہ اجتماعی لاشعوران تجربات ومشاہدات اور تصورات کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ جو کسی قوم یا مذہب میں نسل در نسل چلے آتے ہیں۔ اور قوم کا ورثہ بن جاتے ہیں۔ الغرض علم نفسیات کے ان نظریات کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ فرائیڈ، اڈلر اور یونگ کے نظریات میں بہت سی باتیں معمولی اختلاف کے ساتھ مشترک ہیں اس لیے کہ ان تمام ماہرین نے اپنے نظریات کی بنیاد ذہن کے لاشعوری عمل پر رکھی ہے اور وہی علم نفسیات کا سب سے اہم موضوع ہے۔

اگر چہ ان تینوں نے نفسیاتی معاملات پر قلم اُٹھایا اور مختلف نظریات پیش کیے۔ مگر انہوں نے عورت کی نفسیات کی بنیاد حیاتیات پر رکھنے کے بجائے سماج پر رکھی۔ فرائیڈ انسان اور سماج کو آزادی یا زندگی نہیں دیتا بلکہ وہ فرد کو زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے۔ جس کا احساس کچھ دیر کے بعد ہوتا ہے۔ اور یہی چیزیں عورت کے اندر کمتری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اور وہ ساری عمر اسی کمتری سے لڑتا ہے۔ اور جب عورتیں اپنے احساس کمتری پر قابو پانے میں ناکام ہوتی ہیں۔ تو تخلیقی قوت کو بروئے کار لا کر با اثر بننے سے رہ جاتی ہیں۔ تو وہ نیوراتی ہو جاتی ہیں۔ فرائیڈ اور

ان کے دوسرے شاگردوں نے عورت کے تحلیل نفسی (Psychoanalysis) پر زور نہیں دیا اور نہ ہی انہوں نے عورت کی نفسیاتی اُلجھنوں کو سمجھنے کیلئے حالات کا جائزہ ضروری قرار دیا جبکہ اس مرد اساس معاشرے میں عورت کو جگہ جگہ پر تنقید کا نشانہ بنایا انہوں نے عورت اور مرد کی باہمی کشش کا نام ہی نہیں بلکہ اسے وسیع معنی میں استعمال کیا ہے انہوں نے عورت کے اندر چھپی ہوئی تخلیقیت کو سمجھنے کے بجائے اسے بہ حثییت کمزرو فرد سمجھا ہے۔ حالانکہ ہر انسان کے اندر تخلیقی صلاحتیں پوشیدہ ہیں۔ عورت بھی فطرت اور تہذیب کے درمیان پروان چڑھنے والی ایک شئے ہے جو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بہتر انسان بن سکتی ہے اہم بات یہ کہ عورت کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو باہر نکلنے کا موقعہ دیا جائے تا کہ وہ خود کو ثابت کر سکے مگر اب زمانہ یہاں تک پہنچ گیا۔ کہ اب عورتیں مرد کے شانہ بہ شانہ سرگرم عمل ہیں۔ عورتوں کے جسم توانائی سے بھرپور ہیں۔ لیکن باعث الجھن ہیں اس کے برعکس ''ترنم ریاض'' کا افسانوی مجموعہ'' ابابیلیں لوٹ آئیں گی''۔ جس میں تقریباً ۲۱ افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانے میں ''عورت کی نفسیات'' کو اُجاگر کیا، انہوں نے اور عورت کی فطرت، ہمدردی پر کب کا قلم اُٹھایا اور نسائی آواز کو اپنی تحریر میں جگہ دی اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں عورت کے درد کرب، گھٹن اور نفسیاتی الجھنوں کو اس طرح پیش کیا۔ کہ ہر افسانہ قاری کا دل پڑھنے سے تڑپ اُٹھتا ہیں۔ جسے افسانہ ''مٹی'' جس میں ''ماں'' اپنے بیٹے کی اچانک غائب ہونے پر پاگلوں جیسی حرکتیں کر بیٹھی۔ جب ماں سڑک پر نکل آتی، کسی لڑکے کو جینز ٹی شیٹ (Jeans T Shirt) پہن کر بغور دیکھتی ہے۔ اور اپنے بیٹے کے متعلق اکثر پوچھتی ہے تو مایوس ہو کر رو پڑتی ہے افسانہ ''برف گرنے'' والی میں جاوید کی ماں جاوید سے یہ کہتی کہ بیٹا اپنی پوری زندگی مت

کھودو۔ ہماری پیٹ بھرنے کیلئے ''میرے لعل ہمارے پیٹ کیلئے اپنی زندگی مت بیچنا''۔ یہ ماں کی نفسیات جو اپنے بیٹے کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ افسانہ ''برآمدہ'' جس میں ''شہلا'' کی نفسیات اُبھرآتی۔ جب اس کو اپنا ہی شوہر دوسری عورتوں میں زیادہ دلچسپی دکھاتا تو ''شہلا'' کیلئے یہ برتاؤ کسی اذیت سے کم نہیں اس ماحول میں اسے گھٹن سی پیدا ہوتی ہیں اس وقت عورت کی نفسیات فرائیڈ کے مطابق کیا ہوسکتی، نہ جانے کتنے سوالات اسکے ذہن میں ہوسکتے یا وہ اپنی ہی زندگی کا خاتمہ کرسکتی؟ کیونکہ نسائی نفسیات میں عورت کا فطری پن ہے۔ کہ وہ مردوں کی بے رخی برداشت کرسکتی ہیں۔ حالانکہ عورت کا صبر کا پیمانہ جب لبریز ہو جاتا، تو برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہو ہی جاتی ہے اسی طرح افسانہ ''باپ'' میں پوری نسائی نفسیات اُجاگر ہوتی ہے جس میں ''باپ'' نشے کی حالت میں بیوی اور تین بیٹیوں کو زدکوب کر بیٹھتے ہیں۔ اور بیوی کو مارتے مارتے بسترِ مرگ پر سُلا دیا ہیں۔ پھر بھی ''ماں'' اپنے بیٹیوں کی رکھوالی کیلئے ہر کوئی درد اور عذاب سہہ لیتی ہیں۔ اور اسی حالت میں اپنے بیٹیوں سے کہتی کہ روئیں گے۔ تو اس درندے سے کیسے بچوں گئے۔

الغرض عورت نصف انسانیت ہے جو قدرت کا بیجھا ہو وہ حسین تحفہ ہے۔ جو کائنات کے تمام رنگوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مرد کیلئے اس کی مردانگی باعث شرف ہے نہ عورت کیلئے اس کی نسوانیت باعث عار ہے۔ وہ دونوں انسان کی حیثیت سے اپنی خلقت اور صفات کے لحاظ سے فطرت کا ایک عظیم شہکار ہے۔ عورت کو نظرانداز کر کے نوع انسانی کے لیے جو بھی پُروگرام بنے گا وہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔ دنیا ایسے کسی سماج اور معاشرے کا تصور نہیں کرسکتا جو صرف مردوں پر مشتمل ہو اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ جبکہ

اصیلت یہ ہے۔ کہ دونوں ایک دوسرے کیلئے یکساں محتاج ہیں۔

☆☆☆

فصل باب ب

ادب اور نفسیات کا رشتہ

ادب اور نفسیات کا رشتہ :۔

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں۔ جس میں روزمرہ کے خیالات سے بہتر خیالات اور روزمرہ کی زبان سے بہتر زبان کا اظہار ہوتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ کیونکہ انسان دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہے۔ جو تجربے حاصل کرتا ہے جو سوچتا سمجھتا ہے۔ اس کا اظہار وہ ادب کی شکل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب زندگی کے وسیع ترین لمحات کا احاطہ کرتا ہے۔ اور اسی کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔

جبکہ نفسیات انسان اور انسانی زندگی کا وہ مطالعہ ہے۔ کہ تمام علوم وفنون کی بنیاد اسی پر منحصر ہے۔ نفسیات کو بطور علم اور سائنس سامنے آئے ہوئے ابھی صدی ہی مکمل ہوئی ہے۔ اس لیے ادب سے اس کی عمر کا موازنہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نفسیات کے زیر بحث جو موضوعات آتے ہیں ان کا تعلق انسانی زندگی سے ہے۔ ادب اور نفسیات کا تعلق چولی دامن کا ہے۔ ادیب نے نفسیاتی نظریات اور نفسیاتی تحقیق کا مطالعہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ لیکن وہ انسان کے مشاہدے، تجربات اور احساسات کا باریکی سے مطالعہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے اور ایک کا دوسرے پہ مرتب اثرات کا جائزہ لینا ہی نفسیاتی تنقید کا حصہ ہے۔ ادب پاروں کے زریعے ادیب کی شخصیت اور ادیب کی شخصیت کے زریعے ادب پاروں کا تجربہ ایک دوسرے کیلیے Complementry رہے ہیں

جبکہ نفسیات کے ذریعے ہی ہمیں ادیب کے ذہنی اور تخلیقی عمل کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس کی انفرادی حیثیت و شخصیت اس کے ذہنی پیچیدگیاں اور

اس کی تخلیق کا منفرد رجحان سمجھ میں آتا ہے۔

مگر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ادب کا سرچشمہ دل ہے یا دماغ عام طور پر تخلیقی ادب کیلے دل ہی کو سرچشمہ مانا جاتا ہے۔ چونکہ تخلیقی ادب جذبے کی مخصوص طرح کی شدت اختیار کرنے پر ہی وجود میں آسکتا ہے۔ ادب میں ان گوشوں کی پرچھائیاں ضروری ہے۔ جہاں جدوجہد سے حیات کے حسین ہوجانے کی اُمیدیں ہیں۔ جہاں زندگی کو سنوار کیلے خون جگر پیش کیا جاتا ہے اور جہاں مستقبل کو حُسن بخشنے اور زندگی کو زندگی بنانے کے حوصلے ہیں۔ کیونکہ جدید نفسیات نے ادب پر اپنی پرچھائیاں ڈالی ہیں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے متاثر ہوکر ادب میں ایک نیا رجحان پیدا ہوگیا ہے مگر ساتھ ہی اس نظام کو اپنی منزل سمجھ لینا احساس کمتری ہے کیونکہ موجودہ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ تخلیقی کام کی بنیاد انسان کی وہ اصلی جبلتیں ہیں۔ جو فطری طور پر موجود رہتی ہیں۔ اور یہ جبلتیں کبھی علحیدہ نہیں رہتی۔ بلکہ ایک دوسرے سے مل کر فنی تخلیق میں مصروف رہتی ہیں۔

ادب کا اصل موضوع انسان اور اس کی ذات ہے اور انسان اپنے اعمال اور افعال میں ہر لمحہ عقل اور شعور کے اشارے پر نہیں چلتا بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی وہ کسی نفسیاتی تحریک یا جذباتی عمل سے متاثر ہوکر کسی چیز کی طرف راغب ہوتا ہے کیونکہ ادب انسانی تجربوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے نفسیاتی نقطۂ نظر سے ادب کے مطالعے میں ایک طرف تو لکھنے والے کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لینا ضروری ہوجاتا ہے اور دوسری طرف جو کچھ اس نے پیش کیا ہوتا ہے اس پر اس حیثیت سے نظر رکھنا لازمی ہے کہ جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ نفسیاتی

حیثیت سے قابل قبول ہے یا نہیں۔

حالانکہ جدید نفسیات سے دنیا کا جو بھی ادب متاثر ہوا ہے۔اس میں ہمہ گیری، گہرائی اور بے شمار حسین وسعتیں پیدا ہوگئی ہیں شعور اور لاشعور کے ہنگاموں سے فنکار کی تخلیق میں زندگی آجاتی ہے اور لاشعور نے فنون لطیفہ میں نئے نئے اشاروں کو جنم دیا ہے اور فنکاروں کے طریقہ اظہار میں ایک زندگی پیدا کردی ہے۔حالانکہ جدید نفسیات کے زریعے ادب اور ادیب کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو تلاش کیا گیا ہے اور جدید نفسیات کی روشنی میں فنکاروں نے اپنی تخلیقات کو حسن بخشا ہیں۔چونکہ شروع میں براہ راست ادب میں نفسیات کا استعمال نہیں ہوتا تھا جبکہ جدید نفسیات کے روشنی میں آنے کی وجہ سے اب باقاعدہ ادیب اور اس کی تخلیقات کو فرائیڈ،ایڈلر اور یونگ کے نفسیاتی نظریات کے تحت دیکھا جانے لگا ہے جدید ادب میں ہمیں اکثر اوقات فرد، اس کے ذہن اس کی لاشعوری قوت اور ذہنی کفیت کے گونا گوں تجربات کا بیان ملتا ہے ادب میں ان رجحانات کی اشاعت کا باعث فرائیڈ،اڈلر اور یونگ کے نظریات ہیں۔جو اصل میں ان تینوں ماہرین نفسیات کے نظریات کی بنیاد انسانی ذہن کے لاشعوری عمل پر ہے۔جس کی وجہ سے ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔حالانکہ جدید ادب نفسیات کے نئے نظریوں کی روشنی میں فرد اور اس کے ذہنی عمل میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے۔جدید ادب میں ایک مخصوص نظریہ تو کردار کی ذہنی کیفیت کے بیان ہی کو اپنا مقصود سمجھتا ہے۔

ادب دبی ہوئی خواہشوں اور ان عقلی رشتوں کا فطری

اور سماجی ذریعہء اظہار ہے یہ کشمکش ادیب کے لاشعور سے جنم لیتی ہے ادب ایک اہم انسانی عمل ہے جس میں انسانی کردار اور شخصیت کا اظہار ہوتا ہے کسی شخص کی ادبی کوششوں سے اس کے

احساسات، جذبات، رجحانات، اندازفکر، حوصلوں، اُمنگوں وغیرہ کا بہت کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن نفسیات اس مطالعے کو زیادہ منظُم زیادہ گہرا اور زیادہ معتبر بنانے کی کوشش کرے گی۔ کیونکہ نفسیات کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہے۔ جتنا زندگی کا۔ زندگی کا کوئی گوشہ یا شعبہ ایسا نہیں، جو نفسیات کی قلمرو سے باہر ہو۔ ادب چونکہ ایک اہم شعبہ زندگی ہے اس لئے نفسیات سے اس کا تعلق ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔

ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے کو واضح کرنے کیلئے گوناگوں نظریات کے مطالعے اور تجزیئے کی ضرورت آج کئی گناہ بڑھ گئی ہے انسان کا ہر شعوری عمل بنیادی طور پر اس کے ذہن سے وابستہ ہے چنانچہ اس کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کیلئے اس کی ذہنی ساخت اور اس کے ذہنی عمل کا مطالعہ ضروری ہے۔ علم نفسیات کے ذریعے ہم ادیب کا مطالعہ اس کی انفرادی اور مثالی حیثیت سے کرنے کے بعد اس کی تخلیقی عمل کے سر چشمے کا راز پا سکتے ہیں۔ چونکہ تحلیل نفسی جو انفرادی اور اجتماعی طور سے ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ یعنی نفسیات کا تعلق انسانی ذہن و دماغ سے ہے انسان اور انسانی زندگی کیلئے علم نفسیات ایک کُل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بہت سے اجزاء شامل ہیں۔ (انا، خودی، شہوانیت، خواب بیدای، جنسی آسودگی وغیرہ) اور دوسری طرف ماہرین نفسیات کا کہنا ہے۔ کہ ادب دبی ہوئی خواہشوں اور تمناوں کی تسکین کا ذریعہ ہے اور یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے۔ کہ ہر انسان ادیب یا فنکار نہیں ہوتا۔ اسی لیے فنکار عام انسان کے بمقابل زیادہ حساس اور Sensitive ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دبی ہوئی خواہشوں کو ایک خاص طرز واُسلوب اور فنی تکنیک کے ذریعہ ادب کے سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ لاشعوری محرکات قاری کے دل پر ایسا اثر طاری

کرتا ہیں۔ کہ وہ اپنی دبی ہوئی خواہشوں کوتسکین پا لیتا ہے۔

ادب انسانیت کا عکاس ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ جب تک مرد اور عورت دنیا میں موجود ہیں فنون لطیفہ میں ان کے کردار کی عکاسی ہوتی رہے گی لیکن یہ عکاسی ہر ماحول اور ہر دور میں یکسان نہ ہوگی مختلف ماحول مختلف انداز سے انکے تعلقات کی عکاسی کریں گے اور ہم ادب کو نفسیات سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فرایئڈ سے پہلے ادب کو نفسیات کیرو سے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔

فرائیڈ خود لکھتا ہے۔ کہ ''اگر میں ایک نفسیات داں نہ ہوتا، تو ایک ناول نگار ضرور ہوتا''۔ اور بعد ازاں فرایئڈ کے زیر اثر ہی اس کے دوسرے شاگرد اڈلر اور یونگ جیسے ماہرین نفسیات نے تحلیل نفسی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ حالانکہ نفسیات نے تمام علوم وفنون پر اپنے اثرات قایم کیئے ہیں اور بغیر نفسیاتی مطالعہ کے کسی بھی علوم وفنون کا چارہ ہی نہیں۔ جبکہ ادب تو ہے ہی لاشعوری محرکات کا ردعمل انسان کی نفسیات اور اخلاقیات میں چولی دامن کا ساتھ انہیں علحیدا نہیں کیا جا سکتا ہے ادیبوں کو انسانیت کی خاطر لکھنا چاہیے۔ وہ فنکار جو گندگی اور غلاظت سے اُلجھے رہتے ہیں وہ حقیقت کی گہرائی تک نہیں پہنچتے تحلیل نفسی کی دنیا میں سمٹ جانے والے زندگی کو تماشہ سمجھتے ہیں۔ اور پتہ نہیں کہ کب تک وہ ایسا سمجھتے رہیں گے۔

الغرض ادب پر فرائیڈ کا گہرا اثر پڑا ہے۔ بلکہ اُردو افسانے میں فرائیڈ کے زیر اثر نہ صرف مواد بلکہ تکنیک میں بھی تنوع ملتا ہے کیونکہ ادب میں نفسیاتی گتھیوں کی نمائش حقیقت نگاری کی عکاسی ہے۔ یہ حقیقت نگاری اب جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ حظ کے اس منزل تک پہنچتی ہے جہاں لذت پرستی بھی گھٹن پیدا کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ ایک ناول نگار،

افسانہ نویس اور ایک شاعر کیلیے ماہر نفسیات کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ادیب کیلیے فطرت انسانی کا سمجھنا ضرروی ہے۔ نہ کہ علم النفس کے مسائل ومباحث ،نظریات وقوانین کا فطرت انسانی کو سمجھنے کیلیے نفس انسانی کو سمجھنا لازمی ہے۔نہ کہ مختلف دبستان کے ماہرین نفسیات کے کس ڈھنگ سے فائیدہ پہنچتا ہے۔ چونکہ ادب کا تعلق زندگی کے ساتھ مسلم ہے۔ادب تصویر، تصبیر، تفسیر اور تنقید حیات ہے۔مگر ادب ہوتے ہوئے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کیلیے اور اس کی پیشکش کیلیے ہمیں علم وحکمت سے بڑی مدد ملتی ہے۔اس لحاظ سے ادب اور نفسیات کا تعلق واضح ہے۔

☆☆☆

حواشی:۔

۱۔ادب کا مطالعہ از ''اطہر پرویز'' صف نمبر ۳۹، نیا ایڈیشن بعد ترمیم

۲۔ایضا، صف نمبر ۴۰۔۴۱

۳۔ادب کلچر اور مسائل، مرتب از ڈاکٹر جمیل جالبی، صف نمبر ۱۸۔۱۹، ایجوکیشن پبلیشنگ ہاوس دہلی۔

۴۔مقدمہ ابن خلدون، مترجمہ سعد حسن خان یوسفی، صف نمبر ۴۸، بحوالہ جدید اُردو تنقید اصول، شارب ردیلوی۔

۵۔ایضا صف نمبر ۳۲۔

٦۔بحوالہ جدید اُردو تنقید اصول و نظریات صف نمبر ۲۰۸، مصنف شارد ولوی۔

۷۔ایضا صف نمبر ۱۹۲۔

باب ''سوم''

افسانوی مجموعے ابابلیں لوٹ آئیں گی میں نسائی آواز

افسانہ:۔آدھے چاند کا عکس

کردار۔عاطف کی ماں (نسائی کردار)

منصور:عاطف کا باپ، ساکشی

ساحل اور ساحل کی دیدی (کزن)

یہ کہانی ایک چھوٹے بچے عاطف کی ہے جو ابھی ساتویں جماعت کا طالب علم ہے۔اور ایک دوست کے جنم دن کی سالگرہ پر گئے وہاں انہوں نے ساکشی نام کی لڑکی کو دیکھا۔ جو اُسے بہت خوبصورت لگی لیکن یہ ساکشی اُن سے بڑی دسویں جماعت کی طالبہ۔ عاطف جب گھر آیا تو کچھ گھم سم تھا۔ماں نے جب پوچھا تو بولا کہ وہاں ساکشی جو ساحل کی کزن تھی اصل میں جو ساحل کو بہت خوبصورلگی۔شاید اُسے اس کے ساتھ عشق ہو گیا مگر ابھی ساتویں کا طالب علم ۔شام کو جب ساحل اپنے باپ کے ساتھ کمرے میں گئے تو باپ کو سوال پوچھا۔کہ پاپا۔ جب آپ میری عمر کے تھے تو کسی سے محبت کی۔ یہ سوال صبح خاوند نے اپنی بیوی یعنی (عاطف کی ماں) کو بتایا۔چونکہ ''ماں'' ممتا سے بھری بیٹے کی نفسیات کو سمجھ لیا کہ شہزادے کو عشق ہو گیا وہ بھی اس کی عمر کے تین سال بڑے لڑکی سے۔حالانکہ عاطف اب گھم سم سا ہیں۔سکول جاتے لیکن کسی سے بات نہیں کرتے ماں اب تجُسس میں ہیں۔کہ اب کیا کروں۔کچھ روز بعد اس کا دوست ساحل بیمار ہو جاتا اور سکول نہیں جا پاتا۔تو عاطف اسے فون پر ہی سکول کی ہوم ورک (Home work) سے آگاہ کرتا رہتا۔لیکن پھر بھی کئی چیزیں رہ جاتے۔

اسکے بعد ایک دن اچانک دوپہر کو جب عاطفؔ سوچتے سوچتے سو گئے تو دروازے کی گھنٹی بجی۔تو دیکھا کہ دروازے پر ساحل کی دیدی جو سر سے پاوں تک اچھے گھر کی معلوم نظر آئی۔ عاطف کی ماں سے کہا ’’میں نے ساحل سے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔مگر کوشش تھی۔کہ اس کا کام نقل کے کر لاؤں۔اور عاطف کو بیدار کیے بغیر ان کی کاپیوں سے کچھ چیزیں نقل کروا دیں اور عاطف کے کمرے میں گئی تو نیند میں ہی عاطفؔ کا ماتھا چوم کر ایک چاکلیٹ ان کے سرہانے کے پاس رکھ دی۔عاطفؔ جب بیدار ہوا تو پتا چلا کی دیدی آئی وہیں عاطف رو پڑے۔یہاں تک کہ اُس چاکلیٹ کو اپنی چیز کی دراز میں رکھ دیا۔ماں باپ اب اسی فکر میں کہ عاطف کو اس سوچ سے کیسے نکالے۔اس کی مسکراہٹ کو کیسے واپس لائیں گے۔کچھ روز بعد دسہرہ کی چھٹیاں ہیں۔ ان کو خیال آیا۔کہ چھٹیوں کو منانے کیلئے پہاڑی کی طرف چلے گئیں۔تاکہ عاطفؔ کھُلی ہوا میں سانس لے۔اور نارمل ہو جائے۔جس ہوٹل کے کمرے میں وہ ٹھہرے اس کے بغل کے ساتھ ہی ایک اور کنبہ رہنے آیا۔ان کی بھی ایک دیدی (لڑکی) جو بی۔اے (B,A) کی طالبہ ہیں ۔وہ عاطفؔ کے ساتھ گُھل مل گئی۔اور انہیوں نے عاطف کو اپنے ایک اہم راز سے واقف کرایا۔ اس لڑکی کا ایک بوئے فرینڈ(Boy friend) بھی تھا جب وہ اسے مال(Mall) میں ملنے گئی تو عاطف بھی ساتھ تھا۔جس نے عاطفؔ کو ایک کتاب تحفہ میں دے دی۔اور لوٹتے وقت عاطفؔ کافی پرسکون تھا۔اس کے بعد جب وہ گھر چلے آئے۔تو عاطفؔ نارمل تھا اُس نے اپنا سامان خود ان پیک کیا کمرہ ٹھیک کیا۔غرض اُس نے خود ہی اپنے سوالوں کا جواب ڈھونڈ لیا۔صبح جاگ کر اپنے ماں کو کہا’’ کیا ساحل کی دیدی کو بھی کوئی بوئے فرینڈ ہوگا ماں نے جواب دیا۔ہوگا۔

کیونکہ وہ تجھ سے تین چار سال بڑی ہے''

اس افسانے میں جونفسیاتی کردار اپنایا۔ وہ ماں نے اپنایا انہوں نے بیٹے کی نفسیات کو سمجھ کر آسانی سے سارے سوالوں کے جواب دیے۔ اور ماں نے بچے کی نفسیات کو اچھی طرح پہچانا۔ کیونکہ وہ بیٹے کی رگ رگ سے واقف تھی اور آسانی سے اس سوچ وفکر سے باہر نکل لیا۔ جس سوچ وفکر میں عاطفؔ ڈوبنا چاہتے ہیں۔

آخر کار ہمارے نسائی نفسیات کے متعلق کی روشنی میں اس افسانے کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یہ نتائج برآمد کیا جاسکتا ہے۔ کہ افسانے کا مرکزی کردار عاطفؔ کی ماں ہے جو نہایت ہی سلیقہ شعاری اور ہوشیاری سے ایک ماں۔ ایک عورت ہونے کی صورت میں اپنے بیٹے اور بیٹے کے مرد ہونے کی حالت کی نفسیاتی کیفیتوں کو اپنی نفسیات کو اپنی نفسیاتی فہم وفراست اور ادراک سے آسانی سے حل کر دیتی ہے کہ بچے کو (عاطفؔ) تمام سوالات اُبھر دینے کی بڑی محنت کی ہے

لہذا اس افساے میں ترنم ریاض کی نسائی نفسیات کو ممتاز افسانے کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔

افسانہ:۔مہمان

نسائی کردار:۔سپنا،سندری

راوی (مصنفہ)

یہ کہانی ایک معصوم کم عمر لڑکی سپنا کی ۔ جو دوسروں کے گھروں میں کام کرتی تھی سپنا کا باپ بچپن میں ہی انتقال کر گیا اور ماں کو اسکے نانا نانی نے دوسری شادی کر لی ۔ ماں اپنی نئ سسرال چلی گئی ۔اور سپنا ننھال میں نانی کے پاس رہتی اور ماں نئے شوہر کے ساتھ زندگی بصر کرنے لگی اور سپنا کو بھول ہی گئی اور سپنا کی ضرورت تب پڑی جب ماں کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے پید ہوئے ۔تو ماں نے سپنا کو کلکتہ بلوالیا۔ کیونکہ اُس وقت ماں کو یہ مشکل درپیش آتی ۔ کہ گھر کا کام کرنا، بچے پالنا اُس کیلئے مشکل بن گیا۔حالانکہ اب سپنا ننھال میں کافی سیانی ہوگئی تھی اپنا خیال خود رکھتی تھی اور گھر کا سارا کام کاج تو نانی کے گھر میں سیکھ لیا تھا یہاں تک کہ وہ ایک ذمہ دار گھریلو مددگار بن گئی ۔ سارا کام بغیر دماغ نوش کیے سنبھال لیتی تھی ۔ اور نہ کبھی اپنی مفلسی کا رونا روتی اور نہ ہی کبھی قرضے کا رنج وغم بیان کرتی ۔

ایک دن راوی (مصنفہ) سے بات کرتے کرتے کہا۔ کہ اب میری شادی ہونے والی ہیں لڑکا اسے دیکھنے آتا اور دوسرے دن بڑے اعتماد سے کہا کہ میری شادی اسی کے ساتھ ہوگئی ۔ کیونکہ لڑکے نے فوٹو منگوایا پیغام بجھوایا۔ مگر سپنا کے ماں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔مگر سپنا کہتی کہ اس کے بھائی ''راجو'' جو پچھلے سال حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ٹرک سے زخمی ہوا تھا۔اسی

کے پیسے تقریباً 25 ہزار ملنے والے تھے۔ جس سے 10 ہزار راجو کے نام بنک میں جمع کروانا پانچ ہزار میں گھر کا سامان اور جھگی کا چھت اور باقی دس ہزار میں سپنا کا دہیج (شادی کا سامان) اور کچھ دنوں کے بعد لڑکا سپنا کے گھر رہنے آیا لیکن جھگی میں کتنے آدمیوں کیلئے جگہ تھی؟ ماں اور بابو باہر سورہے ہیں۔ جبکہ بچہ لوگ اور مہمان یعنی ہونے والا داماد جھگی کے اندر۔

اصل میں گھر والے ''لڑکے'' کو حقیقی جانتے بھی نہیں اور نہ ہی اس کے گھر والوں کو اور یہاں تک کہ لڑکا کہاں رہتا کسی کو خبر نہیں۔ جب کہ صرف سپنا کے سوتیلے باپ کا ایک دوست جو گاوں کا ہے اسی نے رشتہ لایا اور سپنا کو اس پر اتنا بھروسہ ہوگیا کہ انہوں نے اس سے دل سے اپنا شوہر مان لیا پھر ایک دن سپنا اچانک چپ رہنے لگی کیونکہ ''مہمان'' یہ کہہ کر گاوں گیا کہ اپنا لاسینس رینو کروانا ہیں اور کئی دن بیت گئے مگر مہان کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ جس نے یہ رشتہ لایا وہ بھی گاوں چلا گیا اور مہمان نے ایک مہینے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر دن گزرتے گزرتے مہینے ختم ہوگئے لیکن سپنا کے مہمان کا کوئی سندیش نہیں آیا اور نہ ہی مہمان آیا جس نے مہینے کی پہلی تاریخ کو لوٹنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب سپنا بیمار رہنے لگی۔ کیونکہ آخر بات سچ نکلی کہ سپنا کا دولھا واپس نہیں آیا۔

اب یہاں پر سوال ہے کہ سب سے پہلے سپنا کو اپنی سگی ماں نے اپنے ساتھ نئے سسرال کیوں نہیں لیا؟ دوسری بات جب سپنا کی شادی کی بات ہوئی تو سپنا کے سوتیلے باپ نے ایک ایسے لڑکا کے ساتھ اس کا رشتہ کیوں جوڑا جس کا اصلی نام پتہ کہاں رہتا تک کا پتہ نہیں۔ سپنا کی ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے خود کماتے اور اب سپنا بھی دوسروں کے گھروں میں

کام کر کے شاید مہمان کو کھلائے گئی۔ آخر کیسا سماج ہیں یہ؟

یہاں پر نفسیاتی تاثر اس وقت دیکھنے کو ملا جب سپنا کا دُولھا گھر گیا۔ دو تین دن سے کوئی پیغام نہ آنے پر سپنا کھانا پینا چھوڑ دیتی ہیں۔ اور صرف مہمان کے بارے میں سوچتی رہتی ہیں اور دل کو تسلی دیتے ہوئے کہ کام ڈھونڈنے میں مصروف ہیں مالک امریکہ گیا وغیرہ یہ شاید عورتوں کی نفسیات کی ہی تاثر ہوتی کہ اپنوں کیلیئے کھانا پینا تک بھُول جاتی ہے۔

غرض اس کہانی ''مہمان'' میں جس طرح نچلے طبقے کے بعض کرداروں کی نفسیات اور چھوٹی چھوٹی تمناؤں اور خواہشات کی گرہیں کھول دیتی ہیں وہ کسی ناپختہ ادیب تو کیا۔ خاصے کہنہ مشق لوگوں کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔

افسانہ:۔باپ

کردار:۔باپ۔ماں نسائی کردار،ماں اور ناظمہ۔

تین بیٹیاں۔ناظمہ۔ساحرہ۔اورشائستہ

افسانہ ''باپ'' میں متوسط طبقے کی المناک روداد ہے جس میں 'باپ' کی تمام کمزوریوں اور برائیوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ایک باپ جو نشے کی حالت میں اپنی معصوم بیٹیوں کو بھی نہیں بخشتا۔اس کی نظر میں اپنے خون کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

افسانہ 'باپ' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے اپنی ساری عمر نشے کی حالت میں گزاری۔جو ٹوٹے پھوٹیں (Transitor) ٹرانزسٹرس کی مرمت کرا کے اپنے لئے شراب نوشی اور بڑی مشکل سے ایک وقت کی روٹی کا بندوبست کر پاتا تھا اپنے تین بیٹیوں اور بیوی کو جیسے اپنا مانا ہی نہیں ''ماں'' جومحنت ومشقت کر کے اپنی بیٹیوں کی پڑھائی کا خرچہ پورا کر کے کبھی سلائی اور کوئی دوسرا کام کر کے کیونکہ ماں کو ارمان تھا اپنی بچیوں کی اونچی تعلیم کا۔حالانکہ اس میں باپ کا کوئی ساتھ نہ تھا اس کو تو اپنے علاوہ گھر میں کسی اور کی بہبودی سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔جب تک ماں ٹھیک تھی گھر کا سارا خرچہ اور بیٹیوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچہ خود سنبھال لیتی۔

لیکن باپ نے 'ماں' کو ایک دن ایسا مارا پیٹا کہ کئی دنوں تک بستر سے ہل نہ سکیں۔یہاں تک کہ اندرونی اعضاء میں بھی چوٹ لگی تھی ان کی ٹانگوں پر سیاہی مائل سرخ رنگ کی پپٹریاں جمی ہوئی تھیں۔اور غذا چمچ سے منہ میں ڈالی جاتی اور اب ماں روز بروز کمزور ہورہی تھیں۔

لیکن باپ کیلئے تو ویسے بھی وہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھیں ۔ ماں کی ایسی حالت کی وجہ سے بڑی بیٹی ناظمہ کو اب امی کی جگہ لینی پڑی ۔یعنی گھر کا سارا کام کاج سنبھال لینا پڑا۔اب وہ ہفتے میں دو یا تین دن ہی سکول جا پاتی ۔اس کے اختیار میں ہوتا تو سکول جانا ہی چھوڑ دیتی ۔ کیونکہ ناظمہ کو پڑھنے کے لئے نہ وقت بچتا اور نہ اسے اس طرح کا ذہنی سکون میسر تھا۔ کہ باقی طالب علموں کے پڑھنے کا متحرک بن سکے۔

ایک دن امی نے ناظمہ کو پاس بلا کر کچھ ایسا کہہ دیا تھا۔ کہ ناظمہ ہچکیاں لے کر رو پڑی تھی اور امی نے اس طرح الفاظ کہہ دے۔

''روؤ گی تو اپنے آپ کو اپنی بہنوں کو کیسے۔۔۔۔۔۔۔۔

سنبھال سکو گئی۔ بیٹیا''

یہاں پر ماں نے ناظمہ سے اسلئے یہ کہا ہوگا۔ کیونکہ باپ نہ تو اپنی بیوی سے اور نہ ہی اپنے بیٹیوں سے بات کرتے ہیں ۔ جبکہ اپنی بیٹیوں پر بھی طرح طرح کی نگاہیں ڈالتا ہے۔ ایک دن جب باپ ہاتھ میں ایک بڑا لفافہ لے کر آیا، اور راہداری سے گزرتا۔تو امی اکثر منہ دیوار کی طرف موڑ لیتی ۔مگر آج ماں نے نہ صرف باپ کی طرف دیکھا بلکہ بات بھی کی تھی کہ ہاتھ میں کیا ہے۔

''کفن لایا ہوں تمہارے لیے'' باپ نے نفرت سے غصے سے کہا۔۔۔۔ماں۔۔۔کفن ۔۔۔؟ وہ تو میں سال بھر پہنے ہوئے ہوں'' مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی ۔۔۔شیطان۔۔۔۔۔درندے۔۔۔۔سانپ ہو تم۔اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو۔۔۔۔

سانپ۔۔۔۔ میری معصوم کلیوں کو۔۔۔۔میری بچیوں پر۔۔۔ میری ۔۔۔۔۔امی کی آواز ڈوب سی گئی۔اور بے ہوش ہو گئیں۔

(افسانہ باپ ص۔۔۔(47)

ناظمہ نے باپ کو تھالی میں موٹی سی روٹیاں اور کٹوری میں پتلی سی دال لے کر جب اندر آئی۔تو باپ نے ناظمہ کو دیکھکر زور سے بولا۔''ہری مرچ کہاں ہے'' کیونکہ کئی دنوں سے سبزی انہوں نے لائی نہیں تو ہری مرچ کہاں سے آئیں گئی۔اس پر بھی باپ نے ناظمہ کے شانے کے پیچھے ایک بھاری سی تھپکی دی اور اس کے پوری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اس کے کندھے کو انگلیوں اور انگھوٹے کے درمیان زور سے پکڑ کر آواز دھیمی کر کے بولا'' آج ہری مرچ نہیں ہے کیا؟''

بھلا اس میں ناظمہ کی کیا غلطی واضح رہے انسانی معاشرے میں جتنے بھی رشتے رائج ہیں وہ سب کے سب فطری ہیں لیکن جو رشتے غیر فطری قرار پائے ہیں۔ان میں یہ رشتہ بھی جس کی جانب 'باپ' نامی کردار آنکھیں اُٹھاتا ہے۔ یہ کردار جانوروں سے بھی بدتر ہے۔یہاں اولاد اور باپ کے کردار پر کاری ضرب لگ جاتی ہے۔ یہاں بیٹیاں اپنے ہی گھر میں محفوظ نہیں کیونکہ جب اُن کا رکھوالا ہی رہزن بن جاتا ہے۔

پھر بیٹیاں کہاں محفوظ ہیں؟

دوسری طرف نسوانی آواز یعنی''ماں' کو یہ اندیشہ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے اور کافی تشویش میں ہے اور شوہر کا گلا گھونٹنا چاہتی ہے ماں کا احتجاج یہاں فطری ہے

حالانکہ وہ ایک طرف کفن کب کا پہن چکی ہے۔شاید آگر وہ ہوش و طاقت میں ہوتی تو اپنے شوہر کو خود ہاتھوں سے سنگسار کرتی۔

اصل میں اس افسانے میں ترنم ریاض نے 'امی' ایک کمزور اور بیمار کردار کے طور پر استعمال کر کے ایک حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ایسے ہزاروں واقعات ہمارے سماج میں اُبھر رہے ہیں۔جن پر سماج کے نام نہاد لوگ پردہ پوشی کر کے چلے جاتے ہیں۔اور نسائی آواز کو اُبھرنے نہیں دیتے۔

افسانہ:۔اچھی صورت بھی کیا

کردار:۔لعل جی

نسائی کردار:۔ثنا۔رضیہ بی۔

''راہل (اغوا کیے ہوئے بچے۔)

افسانہ ''اچھی صورت بھی کیا'' ذہن میں عجیب وغریب تاثرات پیدا کرتی ہے۔جس میں تمام واقعات مل کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔اور ایسی تصویر جس کا رنگ پوری فضا پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس افسانے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کس حد تک سخت گھمبیر ہیں۔یہ کہانی ایسے بچوں کی۔جن کو ایک گروہ نے اُٹھا لائے ہیں۔جن میں خاتون رضیہ بی مرد لعل جی شامل ہیں۔راہل جو کم عمر کا چھوٹا لڑکا ہے۔جس کے والدین ایک ہی دفتر میں کام کرتے ہیں۔لیکن باپ شرابی ہونے کی وجہ سے اکثر نشے کی حالت میں ہوتے ہیں اور کھا پی کر سو جاتا۔جبکہ ماں اکثر رات بھر روتی رہتی ہیں۔جب باپ کو غصے کی آواز اور ماں کی سسکیاں واضح ہو جاتیں تو راہل گھر کے کسی کونے سے نکل کر ماں کے پیٹ میں اپنے چھوٹے چھوٹے گھٹنے ٹھونس کر سو جاتا۔

اور ایک رات راہل نے باپ کو ہاتھوں کی جگہ ماں کو ایک پرانی ہاکی سے مارتے دیکھا اور ماں کے سر سے خون کی دھار بہہ نکلی تو وہ بہت ڈر گیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔اور باپ کے غصے میں کانپتی آواز سن کر وہ بھاگنے لگا جب راہل اندھیرے میں بھاگنے لگا۔تو راضیہ بی نے اندھیر کا فائدہ اٹھا کر اور بھاگتے بچے کو دیکھ کر اس کے قریب پہنچی اور اُسے اپنے ساتھ لے

آ ئے ۔ جب راہل کو اندھیرے میں کوئی دکھائی نہ دیا اور نہ کچھ سوجھ پایا۔تو اپنا خوف زدہ چہرہ
رضیہ بی کے دامن میں چھپا لیا اسی طرح دوسرے بچوں کے ساتھ بھی شاید ایسے ہی واقعات
پیش آئے ہوں گے۔دوسرا بچہ ایک سنسان بس اسٹاپ پر نیند میں جھومتا ہو ملا۔جس سے سکول
بس چھوڑ گئی تھی ۔اور ابھی اسے لینے والا نہ پہنچا۔اور مستری (اہل صرفہ کا افسر) نے بچے کو تنہا
نیند کی حالت میں پا کر اُٹھا لے آیا اور آگے چل کر کاغذ جمع کرنے والے بورے میں دیا اور
مستری نے ہی تیسرے بچے کو لایا تھا۔اپنے پڑوسی کے گاوں کی ایک بڑھیا کا پر پوتا جس نے
اس پڑھائی کا لالچ دیا۔مگر بد قسمتی سے کچھ ماہ بعد بڑھیا کا انتقال ہو گیا۔اور بچے کا کوئی اور نہ تھا
۔رضیہ بی اور اس کے گروہ نے ان بچوں کو بھیک مانگنے پر معمور کر دیا۔شہر کے ٹریفک سگنلز
(Traffic Signal) کے پاس یہ بچے بھیک مانگا کرتے ہیں اور پیسے جمع کر کے رضیہ بی
اور اس کا گروہ شام کو ہڑپ لیتے ایک دن ثنا نامی لڑکی شہر کے ایک خاص چوک سے گذر رہی تھی
کہ دسمبر کی سردی میں سڑک کے کنارے پر ٹھٹھرتے ہوئے چار پانچ سالہ ایک بچے کو بھیک
مانگتے دیکھا۔اور شام کو جب واپس گاڑی میں آئی تو وہی بچہ اب رو رو کر بھیک مانگ رہا تھا
جس کے بھرے بھرے سنہرے گالوں پر موٹے آنسو پھیل رہے تھے۔اس کے پیارے
چہرے کو دیکھ کر ثنا کے دل میں ہمدردی کے ساتھ پیار بھی اُمڈ آیا کیونکہ یہ بچہ جو آج ثنا نے چوک
میں دیکھا وہ بھیک مانگنے والے اکثر بچوں سے مختلف تھا۔دیکھنے میں صحت مند نظر آ رہا۔
خوبصورت بھی بہت ، گورا ، رنگ سنہری بال ، بھوری آنکھیں اور یہ بچہ کچھ اس انداز میں رو کر
صدائیں لگاتا تھا۔کہ سننے والے کے دل دہل جاتے ہیں آنکھیں نم ہو جاتی ہے۔ثنا گھر

پہنچتے ہی بچے کا چہرہ، رو رو کر بھیک مانگنا، صدائیں لگانا اس کا کاروباری انداز ہو سکتا مگر آنسو بہانا۔ بڑے سوال جو ثنا کے دماغ میں گھوم رہے ہیں اور انہوں نے علاقے کے انسپکٹر کو فون کر کے سارا ماجرا بتادیا۔ صبح جا کے انسپکٹر اپنے سپاہیوں سمیت جائے وقوع پر پہنچے تو دیکھا کہ بچے کی آواز اب تقریباً بیٹھ ہی گئی تھی۔ انسپکٹر نے جب بچے کو نام پوچھا تو اسی اثنا میں رضیہ بی آ پہنچی ۔جنہوں نے پولیس کو بتادیا کہ یہ میرا بچہ ہے جو اصل میں اس نے محرا بنادیا اور اغوا کیئے بچوں کو جب سامنے لایا۔ تو انہیوں نے کہا'' کہ رضیہ بی ہماری سچی مچی کی ماں ہے۔ جو بھیک مانگ کر پیسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جس کے بعد میں پولیس نے انہیں پکڑ کر تھانے میں بند کر ڈالا اور راہل کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جس کی ٹانگ میں ایک گہرا زخم ہوا اور وقت پر علاج نہ ملنے سے زخم میں Tetanus پھیل گیا تھا۔ ان تینوں بچوں میں راہل سب سے زیادہ خوشکل تھا۔ اور ثنا ہسپتال میں راہل کے پاس رہی تھی اور اسے اپنے والدین کا نام معلوم تھا یہاں تک کہ اپنے ایریا(area) کا جس سے وہ جواہر نگر بتا تا تھا۔ مگر پولیس کو اس کے گھر والوں کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی کیونکہ ہر شہر میں ایک آدھ جو ہر نگر پایا جاتا ہے۔ اور ثنا روز اسے اس کی اُمید بندھاتی تھی کہ اس کے گھر والے اسے لینے آنے والے ہیں ۔مگر کون جانے کہ اس کے گھر والے آئے بھی ہے کہ نہیں۔۔۔۔

یہاں پر سوال ہے کہ اس رات اس کی ماں ہا کی کی مار سہہ بھی پائی تھی کہ نہیں۔۔۔؟؟ آخر اگر چہ اس کے دونوں ماں باپ ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ تو وجہ کیا تھی۔ کہ باپ اکثر نشے کی حالت میں ہوتا۔ اور بنا وجہ راہل کی ماں کو مارتا پیٹتا۔۔۔۔؟

اور یہاں تک کہ باپ نے کبھی زحمت نہیں کی۔ اپنے لخت جگر کو ڈھونڈ نکالے اور کیا واقعی حالات اتنے سخت اور گھمبیر ہوئے۔ کہ عورت ہی بچوں کو اغوا کرنے کے گروہ میں شامل ہیں۔

آخر اس کی ممتا نہیں اُبھری۔ بچوں کو بھیک منگوانا۔ اور وہی پیسے بچوں سے چھین لیتی

اس افسانے میں نسائی نفسیات کے لحاظ سے ثنا نے ہمدردانہ کام کیا۔ حالانکہ وہ اس طرح کے کاموں میں مصروف رہتی تھی اگر چوک میں ثنا راہل کو اس حالت میں نہ دیکھتی تو شاید نہ جانے آج راہل کس حال میں ہوگا۔

یہ صرف راہل کی کہانی نہیں نہ جانے اور کتنے راہل ہونگے۔ جو ماں باپ کے روز کی لڑائیوں سے اس طرح کی زندگی گزار رہیں ہونگے۔ جو ماں باپ کی تناؤ بھری زندگی دیکھ کر کشمکش اور مایوسیوں کے سایہ میں اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور فکر کو زنگ آلود اور گرد آلود پا رہے ہونگے۔

افسانہ:۔مٹی

کردار:۔ ہلال احمد۔ ہلال احمد کا باپ،

نسائی کردار:۔ ماں

کرشن لال، غلام حسن، ہلال احمد کا ہمسایہ

افسانہ ''مٹی'' میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی لکھی گئی ۔ جو ریجنل انجینر نگ (Regional Engineering) کالج کا طالب علم تھا اپنے کلاس کا ذہین اور ہونہار طالب علم جو بچپن سے ہی بجلی کی تاروں کو درست کرنا، نلوں کو ٹھیک کرنا اور خراب چیزوں کو کھول کر کارآمد بنانا وغیرہ ماں باپ نے اس کا یہ رجحان دیکھکر انجینر نگ کالج میں جوائین (Join) کروایا۔ اور میکینیکل (Mechnical) انجینر نگ کے شعبے میں داخلہ ملا مگر ہلال احمد کے والدین کا یہ خواب پورا نہ ہو پایا بدقسمتی سے ہلال احمد کو بے گناہ ایسی جگہ پکڑا گیا۔ جو ہلال احمد نے چُنا ہی نہیں اور ہلال احمد کے باپ کو بے گناہ وردی پوش والوں نے اپنے ہی علاقے کے کھلے میدان میں گولی ماردی گئی ۔ جب ایک دن اعلان کیا ۔ کہ سب لوگ گھروں سے باہر نکل آئیں کچھ شر پسندوں کی تلاش ہے تو پورے علاقے کے لوگوں نے جلتے چولہے بُجھا دئے یعنی کام آرام سب کچھ بیچ میں چھوڑ کر باہر نکل آئے اور لوگوں کو بڑے میدان میں جمع کئے گئے ۔ مرد عورتیں بوڑھے بچے سب وردی پوش اندر گھروں کی تلاشی لے رہی تھی ۔ اسی دوران ایک وردی پوش جب ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانے والا تھا ۔ تو اس کے پتلون کے پچھلی جیب میں سونے کی ایک زنجیر جھانک رہی تھی ۔ وہ جلدی میں شاید اسے اچھی

طرح ٹھونس نہ پایا تھا۔

''میری بچی کی ہے۔۔۔۔اس کی شادی کے لیے۔۔۔۔۔۔''

یہ ہلال احمد کا ہمسایہ غلام حسن زور سے بولا اور دوڑ کر وردی پوش کے پاس پہنچ گیا۔لیکن وردی پوش نے اس طرح واپس غلام حسن پر وار کیا۔

''خاموش بڑھے۔۔''دلیش دورہی'' طاقت سے بوڑھی کمزور ٹانگوں پر تندرست لات ماری۔ غلام حسن بیچارہ لڑکھڑا کر گیا۔اوراس کا پاوں پکڑ لیے۔''خدا کے لیے میری۔۔۔۔''

چھوڑ حرام خور۔۔۔۔مفت کا کھا کھا کر طاقت آ گئی ہے۔راشن پر سبسڈی ملتا ہے نا۔ہم کو ہی آنکھ دکھاتا ہے''

وہاں پراس وردی پوش نے بندوق بوڑھے شخص کی طرف تان دی مگر دور سے شایداس کو اپنا آفسر آتا دِکھائی دیا۔لیکن اس کمزور بوڑھے کو زوردار وار کیا جو زمین پر گر پڑا۔بوڑھے کی بیٹی اپنے باپ کو بچانے کیلئے آ گئی تو وردی پوش نے اس کو بالوں سے پکڑ کراوپر اُٹھایا اور دھکا دے دیا۔کھلے میدان میں سب لوگ یہ منظر دیکھکر خوف زدہ ہوئے لڑکیاں اپنے رشتہ داروں کی آڑ میں چھُپنے کی کوشش کررہی تھیں ہرطرف چیخ وپکار ہورہی ہے۔

''یہ۔۔یہ کیا۔کیا ہورہا ہے قیامت۔۔۔۔قیامت کبرئی''

ہلال احمد کا باپ چیخ پڑا۔۔۔۔۔دبی دبی سسکیوں میں اس کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔

لیکن اچانک ایک گولی زن سے اس کے پہلوں کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔وہ وہیں پر ڈھے گیا۔ہلال احمد کی ماں ایک فلک شگاف چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی۔اس رات سارے

علاقے میں خوفِ ودہشت کا ماحول تھا ہر طرف آہ و بکا دلخراش منظر لختِ جگر اپنے اپنے ممتا بھری آنچل کی پناہوں میں کھو جانا چاہتا ہلال احمد اپنی ماں کو تسلی کا ایک جملہ بھی نہ کہہ سکا، ایک دم وہ ماں کی باہوں کا حلقہ توڑ کر نکل آیا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ لمحوں کیلئے پتھر کا بت کی طرح جامد ساکت آنکھیں پھیلائے ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا خدا جانے اسے کدھر جانا تھا۔ جب وہ کھیتوں کے کنارے والے گاوں سے گذرا تو اسے راکھ گھروں کے پاس ادھ جلی لاشیں نظر آئیں کہیں سالم، کہیں آدھی کہیں اعضاء جیسے کسی بچے نے کالی مٹی سے انسانی مورتیں بنانے کی کوشش کی ہو اور ناکام ہونے کی صورت میں انہیں آدھی ادھوری چھوڑ کر پھینک دیا ہو۔

اصل میں ہلال احمد کو بے گناہ ایسی جگہ پر پڑا گیا۔ جو ہلال احمد نے چُنا ہی نہیں۔ ہلال احمد کی گرفتاری کے بعد اس کی ماں کی کیسی حالت ہوئی ہے وہ اس طرح ہیں۔

اس کی ماں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سڑک پر نکل آتی کسی لڑکے کو جینز، ٹی شرٹ پہن کر بغور دیکھتی ہے اور ہلال احمد کے متعلق اکثر پوچھتی ہے مایوس ہو کر رو پڑتی ہے۔ کیونکہ ہلال احمد اچانک غائب ہے پتہ نہیں اس کی ماں اپنے لختِ جگر کو کب دیکھے گئی۔ دیکھے گئی بھی یا ـــــنہیں۔

افسانہ ''مٹی'' کا ذکر کرتے ہوئے ترنم ریاض ایک جگہ لکھتی ہے۔

''افسانہ مٹی'' نے بھی از حد سنجیدہ کیا تھا۔ مجھے اس افسانہ کو تحریر کرنے سے پہلے میں کچھ دیر کیلئے اس ماحول میں رُکی وہاں کی گھٹن درد کرب اور ہر شے پر محیط مایوسی میرے اندر جذب ہو گئی

تھی تب ''مٹی'' کا ظہور ہوا ان باتوں میں کتنی صداقت ہے اس کا اندازہ افسانہ پڑھ کر ہی ہوتا ہے اگر چہ یہ افسانہ ایک مخصوص ماحول اور مسائل کے پیداوار ہے لیکن ترنم ریاض کی تخلیقی بصیرت نے اس افسانے کو علاقائیت سے اوپر اُٹھا کر ایک آفاقی عظمت عطا کی ہے نام نہاد دہشت گردی کے نام پر آج دنیا کے مختلف علاقوں میں جنگیں لڑی جا رہی ہیں ان جنگوں میں ایک عام انسان بے وجہ پیسا جا رہا ہے اور عام انسان پر اس طرح کے ماحول سے کیا اثر پڑ رہا ہے وہ ہم دیکھ رہے ہیں۔اور محسوس بھی کر رہے ہیں''مٹی'' افسانے میں افسانہ نگار نے جنگ سے متاثر ایک مظلوم انسان کے مظلومیت اور مسائل کو جس فنکاری سے پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ہلال احمد کی گرفتاری اور کشن لال سے ہلال احمد کی گفتگو کو مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

یہاں پر ترنم ریاض نے وردی والے کے ذریعے سے اس بات کی طرف قاری کے ذہن کو متوجہ کیا ہے کہ اب اتنا ظلم و جبر کب تک اور کیوں برداشت کرتے رہو گے۔آخر ہمارا قصور کیا ہے؟ ایک دن ضرور تمہارا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ نظام تم کو اپنے حقوق سے بھی محروم رکھے گا اس لئے زیادہ مظلومیت کا شکار ہونے سے بچو اور اپنے حقوق کیلئے بیدار ہو جاؤ۔حقوق جب بھی ملیں گئے حقوق کو طاقت اور لگن سے حاصل کرتے رہو گے کیونکہ جو قوم اور جو لوگ حالات سے لڑتے ہیں۔اور حالات کو اپنے مطابق کر لیتے ہیں وقت انہی کے ساتھ صحیح فیصلہ کرتا ہے۔

اس افسانے کے کرداروں کی نفسیات اور جذبات کی عکاسی میں افسانہ نگار نے بڑی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے اور واقعی یہ افسانہ اردو کے اچھے افسانوں کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

افسانہ:۔ایجاد کی ماں

نسائی کردار:۔میرو مامی (مہر والنساء)

کردار:۔ماموں

سلیم، ہیرو، مریم (میرو مامی کی بیٹی۔ابراھیم چاچا۔صاجی۔ابراھیم چاچا کی بیوی

یہ کہانی ایک چھوٹے لڑکے سلیم کی ہے۔جس کی ماں بچپن میں ہی انتقال کرگئی اور باپ تمبا کو کا عادی تھا کھانستے کھانستے خدا کو پیارا ہوگیا جس کی وجہ سے ماموں سلیم کو اپنے گھر لے آئے۔ سلیم ماموں کے گھر پر آدھے سے زیادہ کام بہت کم وقت میں نپٹا لیتا ہے تو مامی اُسے اپنے گھر میں برداشت کرنے لگی مگر پھر بھی اِسے اس کے کام پر غصہ آتا رہتا اور وہ سلیم کو اکثر مارتی پیٹتی پہلے پہل سلیم مار کھاتا اور روتا۔اب آہستہ آہستہ اس نے رونا چھوڑ دیا۔ یہ سب ماموں کی غیر حاضری میں لیکن ماموں کے سامنے مامی سلیم کو کھانا کھلاتے وقت چولہے کے پاس بیٹھاتی۔ حالانکہ مریم اور ماموں دونوں سلیم سے پیار کرتے تھے۔بس ایک ممانی۔

ماموں کا گھر پہاڑیوں کی دامن میں ایک چھوٹے سے گاؤں کے آخری سرے پر تھا سلیم صبح ہی صبح بھیڑوں کو چرانے لے آتا اور سہ پہر ہوتے ہوئے لوٹ آتا۔

ایک دن سلیم نے ندی کی مشرقی سرے کی جانب ابراھیم چاچا کی پن چکی پر معمول سے کچھ زیادہ لوگ نظر آئے سلیم بھی چکی کی طرف دوڑا۔ وہاں عجیب منظر دیکھا کہ ابراھیم چاچا کی تیسری بیوی صاجی چوکڑی مار کر بیٹھی (آلتی پالتی) سارے بال کھلے،اور زور زور سے سر ہلا ہلا کر ایک ردھم سے سانس لیتی ہوئی جانے کیا کہہ رہی تھی۔

ابراھیم چاچا نے جب دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ابراھیم چاچا صاجی کو کھونا نہیں چاہتا اس سے پہلے کی دونوں بیویوں کے انتقال کئی سات سال بعد بیوی صاجی سے ۶ مہینے پہلے ے نکاح کیا تھا اور اس نے آتے ہی گھر سنبھال لیا اور اپنی گھر ہستی میں خاص مسرور و مصروف تھی۔ لیکن اُس دن صاجی کو شاید کوئی جنگلی بھوت (جن) آ گیا تھا، جسکی وجہ سے ان حالات میں صاجی کی آواز مردانہ ہوگئی اور سب لوگ گھبرا گئے پھر پیر صاحب کو بُلایا جب پیر صاحب نے صاجی سے باتیں کی تو آواز آئی کہ میں بڑے بابا۔ جو چھوٹی پہاڑ پر پیر کا مقبرہ ہے جسے ٹھیکری کہتے ہیں جس کے نام پر صدیوں سے کوئی بھیڑ نہ بکرا خیرات کیا۔ جب بھیڑ خیرات میں بانٹا۔ تو صاجی نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولی اور ٹھیک ہونے لگی۔ اس دن سلیم نے بھی بھیڑوں کو چُراگاہ کے پاس چرانے کیلئے چھوڑ دیا اور خود ٹھیکری کے گرد گھومتا رہا۔ جب سلیم کو گھومتا دیکھا تو صاجی گھبرا گئی تھی اور سلیم کو آواز دینے لگی اسی اثنا ماموں بھی آئے اور سلیم کو بچا لیے۔

اس افسانے میں جہاں تک نسائی آواز کی بات ہے وہ میرو مامی'' جن نے سلیم کو کبھی اپنے بیٹے کی طرح محبت نہیں کی۔ نہ کبھی پیار سے سلیم کو بھلایا۔ حالانکہ سلیم کم وقت میں زیادہ کام نپٹا لیتا۔ پھر بھی میرو مامی اِسے مارتی پیٹتی۔ اس کے برعکس اس کی بیٹی مریم سلیم سے بہت پیار کرتی۔ اپنے کھانے سے گوشت کا ٹکڑا اماں کے نظروں سے چوری چھپے سلیم کے کھانے پر ڈال دیتی۔

جب میرو مامی نے سلیم کو گھورتے دیکھا تو گھبرا گئی اور پہلی بار سلو بیٹے اس کے منہ

سے نکلا سلو بیٹا سنتے ہی سلیم دِھپ سے نیچے بیٹھ گیا اور زور زور سے سر جھٹک جھٹک کر جسم ہلانے لگا۔ یہاں پر سوال ہے، کہ سلو نام سنتے ہی سلیم کیوں حیران رہ گیا۔شائد اس آواز میں اس کی ماں کی یاد آئی ہوگئی، اور میر و مامی کیا ماں نہیں سلیم کو وہ اپنے بیٹے کی طرح پیار نہیں کرتے ۔

☆☆☆

افسانہ:۔ بابل

نسائی کردار۔ دُلہن۔ افسانے کی ہیروئین

کردار:۔ چشمے والا آدمی ،لڑکا، دُلہا۔ نوعمر لڑکا

بابل کی دُعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے۔

میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں اتنا پیار ملے۔

بابل کی دعائیں۔۔۔۔۔۔۔(سامرلدھیانوی)

بابل افسانہ ایک خوبصورت لڑکی کا ہے۔ جو تین چار دن پہلے بیاہی ہوگئی تھی اور اُس کو اپنے والدین (بزگ)، چھوٹی بہن ملنے آئی تھی اس افسانے میں مصنف نے ایک پلیٹ فارم کی عکس بندی کی ہے جو یہاں ایسی منظر کشی کی عکس بندی کرتی ہے۔ کہ اس کے گھر والے اسکو اس کے سسرال آئے تھے مصنفہ نے plate form پر ایک ایسا منظر پیش کیا کہ لڑکی کے والدین اور سسرال والے سارے موجود تھے۔ جو اصل میں دور سے لڑکی کو ٹرین سے ملنے آئے ۔اور پلیٹ فارم پر لڑکی اور اس کے سسرال والے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ جس میں چشمے والا آدمی جو اصل میں دُولہا، نوعمر لڑکا جو لڑکی کا دیور اور جیٹھ۔

ٹرین نے plate form پر سیٹی دی تو دور سے تیز رفتار سے چلتا ہوا ایک بزرگ جو لڑکی کا باپ لڑکے کے پاس پہنچا اور اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ تھما کر دُولہا کے پاس گیا اور ایک خوبصورت شال اس کے کندھے پر لٹکا دیا۔ اور خاتون یعنی ماں نے ایک ہاتھ اُٹھا کر اس کا چہرہ سہلایا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اسی اثنا میں ریل نے ہارن بجا دی۔ اصل میں یہ وہ لمحہ تھا۔ جب پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکی کی ماں کافی دیر انہیں دیکھتی رہتی اداس سی ہوگئی تھی ماں کا سر پر ہاتھ پھیرنا تھا۔ کہ دُلہن سی لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں اور آنسو کا ایک قطرہ پلک پر اٹک سا گیا۔

یہاں پر مصنفہ نے ایک درد بھرا جملہ کہہ دیا، ' کہ دُلہن نے حنائی انگلیوں سے ابرو کو کھجاتے ہوئے آنسوؤں چھپانے کی کوشش کرنے لگی تو میرا دل درد سے بھر آیا۔ پتہ نہیں اس کے دُکھ کو میں نے اس شدت سے کیوں محسوس کیا۔

یہاں پر سوال ہے کہ مصنفہ نے کیا محسوس کیا کہ اس کا دل بھر آیا۔ کیا واقعی لڑکی جب پہلی بار سسرال جاتی تو دل پر کیا بیتی اور لڑکی کو جب اپنے والدین کو چھوڑنے پڑتے ہیں تو واقعی دُکھ محسوس ہوتا ہے۔

جب ریل چل چکی تھی پھر بھی دُلہن کے آنکھوں میں آنسو مگر آنسو تو کوئی پوچھنے والا نہیں جبکہ اس کے نئے رشتہ دار کچھ دوری پر مسکرا مسکرا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

مگر عورت کی نفسیات میں ترنم ریاض اس افسانے میں اس طرح کہتی ہیں کہ جب ریل چل چکی تھی مگر میں وہیں کہیں ٹھہر گئی تھی پلیٹ فارم پر روئی ہوئی دُلہن کی اشک بار آنکھوں کے پاس میرا دل بھی وہیں کہیں اٹک گیا تھا پتہ نہیں ایسا کیوں؟

یہاں پر سوال کہ کیا واقعی عورت ایسی نرم دل ہوتی کہ اپنوں کو جب چھوڑنے کی بات آتی تو آنسوں خود بہ خود نکل آتے اور نہ صرف آنسو بلکہ دل بھی رو پڑتا ہے۔

☆☆☆

افسانہ:۔ پھول

کردار:۔ عاقب گھر کا مالک

چھوٹو۔ کام کرنے والا لڑکا

نسائی کردار:۔آنٹی جی، گھر کی مالکن۔

افسانہ 'پھول' دس گیارہ برس لڑکے کی کہانی ہے۔جس کا نام دیوی پرشاد کنو جیا! ضلع انا، اُتر پردیش'' کو اپنی شناخت بتاتا ہے جو گاوں سے شہر میں گھر پر کام کرنے آیا تھا جس کو اصل میں ایک پریس (استری) کرنے والی بیوی لے آئی جسے کام سکھانے کیلئے اس کا بھائی چھوڑ گیا تھا، ''چھوٹو'' نوکر کی حیثیت سے کام کرتا ہے لیکن ''چھوٹو'' سب کچھ سنبھلتا، کھلانے سے کھیلنے تک سارا کام چھوٹو کرتا یہاں تک کہ آنٹی کے جب بچے ہوئے تو اس نے زچگی میں اس کا پورا دھیان رکھا۔غرض چھوٹو سب کام نہایت خوش اسلوبی سے کرتا حالانکہ آنٹی کے پاس بھی اس شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جو آنٹی کے تکلیف میں ساتھ دیتا، کیونکہ آنٹی کے ننھے ننھے جڑواں بچوں کے ایک جیسے تقاضے پورے کرنا اس کے لئے ایک مرحلہ ہو جاتا۔اگر خدا نے دیوی پرساد کو کسی دیوی کے پرساد کی طرح نہ بھیجا ہوتا اتنا ہی نہیں بلکہ آنٹی کے بچوں نے پہلا لفظ جو بولنا سیکھا وہ 'چھوٹو' تھا اور آنٹی اور عاقب بھی اُسے اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے۔ بلکہ اُس کے پسند کے کھانے بنواتے۔یعنی چھوٹو کو گھر کے افراد کی طرح تصور کیا جاتا لیکن اچانک ''چھوٹو'' کے روئے میں تبدیلی آ گئی چھوٹو زیادہ وقت بازار میں گزارتا، گھر میں نہ زیادہ بولتا اور نہ ہی

بچوں سے ہنستا کھیلتا اکثر چُپ رہتا۔ایک دن آنٹی نے اسکو سگریٹ پیتے دیکھا تو دُکھ محسوس ہوا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا چھوٹو۔۔۔۔۔''

جانتے ہو یہ بہت بُری چیز ہے پھیپھڑے تباہ کر دیتی ہے۔

یہ تمہاری دوست پلاتے ہیں نا تمہیں۔۔۔۔۔۔

یہ دشمنی کرتے ہیں بیٹا۔۔۔۔پھر سے کبھی مت پینا ایسی کوئی چیز۔

آنٹی کی باتوں کا چھوٹو پر کچھ اثر نہ ہوا چھوٹو اب باہر اور بھی زیادہ وقت لگانے لگا۔کئی دفعہ جھوٹ بھی بولا اکثر پیسے گم ہو جایا کرتے اس کا ہنسنا کھیلنا بھی جیسے چھوٹ گیا تھا۔

مگر آنٹی کسی بھی قیمت پر کوئی رِسک (Risk) لینے کو تیار نہیں تھی۔چھوٹو کو ضائع نہیں ہونے دونگی۔اور نہ اسے کسی بھی حال میں الگ چھوڑے گی چھوٹو کو کئی دنوں تک ڈی اڈیکشن سینٹر (Deaddication centre) میں رہنے کے بعد چھوٹو اب نارمل ہو گیا۔دو تین برس بیت گئے آنٹی کے بچے اب سکول جارہے تھے۔چھوٹو اب عاقب کی غیر موجودگی میں بخوبی دُکان سنبھلتا۔مگر کچھ وقت بیت جانے کے بعد چھوٹو کی زندگی میں اب سگریٹ کے بجائے شراب کی لت لگی اس کے کمرے میں کولڈ ڈرنک کی خالی بوتلوں کے درمیان شراب کی کئی خالی بوتلیں تھیں۔اور ایک بار پھر چھوٹو کو Deaddication centre میں بھرتی کرا دیا گیا۔ پھر بھی چھوٹو شراب کے نشے سے باز نہیں آیا۔آخر کب تک آنٹی اور عاقب اُسے اس بدعت سے دور رکھیں گے۔ جہاں تک اس افسانے میں نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں آنٹی جی نے واقعی نسائی حق ادا کیا۔

ایک کام کرنے والے کواپنا بیٹا مانا۔اُسے اسی طرح محبت کی جسطرح اپنے بچوں کے ساتھ کی آنٹی اپنے میکے جب گئی تو چھوٹو کو ساتھ لیا۔پہلی بار چھوٹو کو سگریٹ پیتے دیکھا۔تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔صرف یہ سوچ رہی تھی۔کہ کسی طرح چھوٹو کو سمجھاوں۔

جب چھوٹو کو شراب کی لت لگ گئی اس کی ممتا اُبھر آئی اور دل جانے کیوں بے چین تھا۔چھوٹو کو کسی بھی حال میں الگ چھوڑنے والی نہیں۔اور نہ ہی کوئی رِسک لینے کو تیار تھی۔ بلکہ فوراً ڈی اڈیکشن سینٹر میں داخل کرا دیا۔لیکن پھر بھی چھوٹو اپنی غلطی سے باز نہیں آیا۔آخر آنٹی اپنے بچے ہوکے بھی کس کس پھول کو کون سی آندھی سے بچا کے رکھ سکتی آج کے سماج پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

افسانہ:۔اماں

کردار:۔ بابر سارہ کا بیٹا

نسائی کردار:۔آپا۔سکول ٹیچر، سارہ، بابر کی ماں۔

افسانہ ’’اماں‘‘ ترنم ریاض کا ایسا افسانہ ہے جس میں سارہ نام کی ایک غریب مگر شریف لڑکی کی ازدواجی زندگی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو سادہ نہایت، پاک دامن اور مذہب پرست لڑکی ہے جس کی شادی قمر الدین سے ہوئی جو حد سے زیادہ اِندبلا نوش اور بدتمیز ہے قمر الدین نکاح کے بعد سارہ کو دور دراز اجنبی گاوں میں لے جاتا۔ جہاں سارہ کا کوئی رشتہ دار اور شناسا نہیں تھا سارہ کا ایک بیٹا بابر جو اپنی ماں کی طرح ذہین شعار لڑکا ہے۔ایک دن سکول ٹیچر آپا نے اسے نام پوچھا تو اونچی آواز میں بولا.

بابر کا مطلب شیر ہوتا ہے۔میں شیر ہوں۔۔۔جو میری

ماں کو مارے گا میں۔۔۔۔۔میں اُس کو کھا جاؤں گا۔۔۔مگر میں۔۔۔۔ابو۔۔۔۔ابو کو‘

چونکہ بابر کی ماں اچھے گھر کی اس کے والدین نہیں تھے نانا نے اس کی پرورش کی تھی نانا پڑھے لکھے مولوی فاضل تھے اور سارہ بھی صوم وصلواۃ کی پابند خاتون تھی مگر قمر الدین جیسے شرابی اپنی شائستہ بیوی پاکر بھی سدھرنے کا نام نہیں لیتا۔ سارہ اپنے بیٹے بابر کو سکول چھوڑ آتی اور بابر بھی وقت پر سکول جاتے اور جب تک ٹیچر جانے کیلئے نہ کہتے۔تب تک کلاس سے نہ نکلتا۔قمر الدین نہ صرف فحش کلامی کرتا بلکہ ہاتھ بھی اٹھایا کرتا یہاں تک کہ بچے کی موجودگی کا

خیال کیے بغیر بھی جتنا وقت گھر میں ہوتا لڑائی جھگڑے کے نئے نئے بہانے تلاش کر کے اس کو تنگ کرتا۔ یہاں تک کہ ایک دن قمرالدین نے سارہ کو بُری طرح زدوکوب کیا ہے سارہ کا کوئی دور کا رشتہ دار کسی کام سے آیا ہوا ہے۔قمراالدین نے بہانہ بنایا کہ سارہ اس کے رشتہ دار کے ساتھ کچھ۔۔۔۔اس لئے سارہ اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔

قمرالدین نہ صرف آوارہ اور بدچلن تھا بلکہ فحش زبانی کے ساتھ ساتھ سارہ کو بھی زدوکوب کرتا تھا لیکن سارہ اکیلی یہ مصیبتیں برداشت کر لیتی ہے اور کسی سے اپنا دُکھ نہیں بانٹتی سارہ کا واحد بھروسہ خدا کی ذات پر ہے جس سے وہ ہمیشہ دُعائیں کرتیں رہتی ہے۔

جہاں تک اس افسانے میں نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں مرکزی کردار 'سارہ' کا ہے جس نے خاوند کی ہر کوئی مصیبت برداشت کرنے کے باوجود اپنے بیٹے بابر کو اچھی صلاحیت اور تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے پر پیچھے نہیں ہٹتی اسکے علاوہ اس افسانے میں ایسے معاشرے کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ جہاں نہ جانے کتنی عورتیں سارہ کی طرح بے بس اور لاچارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئی ہوں۔جن کا واحد سہارہ بس خدا کی ذات ہے۔

افسانہ:۔مائیں

کردار:۔بیٹی کے دو بیٹے

نسائی کردار؛۔ماں۔بیٹی

''مائیں''افسانے میں دو تین کردار پائے جاتے ہیں۔ایک''ماں''اور اسکے دو بیٹے اور اسکی ''ماں''افسانے''مائیں''میں محبت کی علامت کا منظر پیش کر رہے ہیں۔جس میں ''ماں''اپنی بیٹی کے گھر پر کچھ دیر رہنے کیلیئے جاتی ماں اکثر سردیوں میں کچھ وقت اپنی بیٹی کے یہاں گزارا کرتیں مگر گرمیوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ روانہ ہو جاتیں مگر موسم اچانک کیا بدلا کہ۔۔۔۔۔پریشان ہوگئی بیٹی۔۔۔۔کیونکہ امی پہاڑی علاقے میں رہتی۔جہاں ان موسموں کی عادت نہ تھی۔مگر شہر میں بیٹی کے گھر میں گرم ہوا نے ماں کے ضعیف وجود کو ایسے جھنجھوڑ دیا کہ وہ تمازت سے جھلس جاتیں۔

Writer مصنفہ نے اس افسانے میں ایک ایسی رات کی منظر کشی کی ہے۔جسمیں بجلی بھی چلی جاتی اور کمرے میں سونا محال ہو جاتا ان حالات میں امی کی حالت خراب ہو رہی تھی اِدھر اُدھر بیقرار چکر لگائیں کبھی غسل خانے میں جا کر لباس پر پانی چھڑکتیں مگر بیٹی صرف دُعائیں مانگتی کہ جلد بجلی آجائے۔جب ماں کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ ماں کمرے میں کھڑی دکھائی بیقراری کی حالت میں۔ماں کہتی کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔

شاید۔۔۔۔۔میری

موت۔۔۔۔۔مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔۔۔۔۔۔

بیٹی ماں کی یہ حالت دیکھ کر کہتی ۔ چلو چھت پر چلئے ۔ وہاں ٹھنڈک سی محسوس ہوگئی ۔ اور چھپت پر واقعی ہوا چل رہی تھی ۔ تو بیٹی نے جلدی سے بچوں کو بھی چھت پر لایا ۔ جہاں 'ماں'' اور بیٹی کے بچے چار پائی پر لیٹ گئیں ۔ اور بیٹی نے ایک اطمینان بھری نظر ان پر ڈالی جہاں تک افسانے میں نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں نسائی کے دو کردار ایک ماں اور اسکی بیٹی جو خود دو بچوں کی ماں ہیں ۔

بیٹی کو اپنے دو بچوں کی گرمی برداشت نہیں ہو رہی ۔ تو دونوں ہاتھوں سے پنکھیاں جھل رہی تھی ۔ کہ کہیں بچے گرمی کی شدت سے جاگ نہ جائیں اور کہیں ان کی نیند خراب نہ ہو جائیں یہ ماں کی ممتا ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس ''بیٹی'' کی ''ماں'' خود ''بیٹی'' کی پریشانی بھی نہ دیکھ پا رہی ۔ خود تکلیف برداشت کرتی رہی اور بیٹی کو کچھ نہ کہتی ۔ ایسی ہوتی ہے ''مائیں'' ۔

افسانہ:۔آبلوں پر حنا

نسائی کردار۔شیریں تانیہ(دونوں شادی شدہ)

نیلما:۔شادی کے بغیر

اس افسانے میں تین کردار جو صرف عورت کے کردار ہیں ۔شیریں،تانیہ اور نیلما۔یہ تینوں ایک ہی ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور ایک ہی ہوسٹل کے کمرے میں رہتے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ ایک ساتھ گزارا۔اب شیریں اور تانیہ نے شادی کی اپنی اپنی گھر گرہستی بسالی ۔لیکن نیلما نے ابھی تک شادی نہیں کی ۔ایک دن شیریں اور تانیہ دونوں نیلما کے گھر ان سے ملنے جاتی جب ان کے گھر پہنچ گئی تو یونیورسٹی کے دن یاد آ گئے اور پھر نیلما کو سوال پر سوال کیا کہ ابھی تک شادی کیوں نہیں کی کیونکہ شریک حیات پا کر انسان خوش رہتا ہے تنہائی میں کبھی کبھی انسان اُداس بھی تو ہو جاتا ہے۔

ان سوالوں پر نیلما ان دونوں سے کہتی کہ ''تم لوگ اداس نہیں ہوتیں ہے'' اپنی سوچوں میں تنہا نہیں ہوتیں کیا ذیادہ تر باتیں انسان اپنے آپ سے ہی کرنا پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔

اس افسانے میں جہاں تک نسائی آواز کی بات ہے۔اس میں تینوں کردار نسائی آواز ہے جس میں شیریں اور تانیہ شادی شدہ جبکہ نیلما کو بھی اصرار کرتی شادی کرنے کیلئے ۔لیکن نیلما ان دونوں کو واپس جواب دیتی کہ ''کیا تم دونوں مجھ سے ذیادہ خوش ہو۔یا میں تم سے کم''۔کیونکہ شیریں نے عادل سے شادی کی۔شادی کے بعد عادل ہر دن اب

زیادہ ہی Aggressive شرارتی ہو رہے ہیں دیر سے گھر آنا اور بغیر بتائے گھر سے چلے جانا۔ ہر بات پر بحث کرنے پر تُل جاتا اب عادل کا معمول بن گیا اور اسی طرح تانیہ کا بھی یہی حال ہے۔ کہتی ہیں کہ ''بھئی مردوں کا تو بس ایسے ہی ہے۔۔۔۔۔۔ ہر وقت برائی نکالنے کی فکر میں رہتے۔

نیلما ان کی یہ حالت زار سن کے واپس جواب دیتی ہیں کہ ''کیا بچوں سے محبت کرنے کیلئے بچوں کو جنم دینا ہی سند ہے'' کتنی بڑھ گئی ہے آبادی۔۔۔۔ کتنے تو ہیں بچے جن کا کوئی ہے ہی نہیں اس دنیا میں'' عورت نہ شادی سے پہلے اور نہ شادی کے بعد خوش رہتی۔ کیونکہ شادی کے بعد نہ جانے اور کتنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آخر کہ بیٹی بھی کسی کی بیٹی ہوتی ہے۔

افسانہ:۔ برآمدہ

نسائی کردار:۔شہلا

کردار:۔جنید۔سہیل

افسانہ ''برآمدہ'' موجودہ سوسائٹی کے ایک اہم مسلے پر مبنی کہانی ہے۔جس میں افسانے کی نسائی ذات یعنی ہیروئین شہلا کا شوہر سہیل دوسری عورتوں میں زیادہ دلچسپی دکھاتا ہے۔شہلا کیلئے شوہر کا یہ برتاو اذیت سے کم نہیں۔ وہ اسے روکنے کی بہت کوشش کرتی ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہو پاتی شہلا کو اس ماحول سے گھٹن سی ہوتی ہے۔حالانکہ یہ ایک فطری عمل ہے۔کہ عورت جس کا مرد دوسری عورتوں میں زیادہ دلچسپی لیتا وہ اندر ہی اندر مر جاتی ہے۔
خود افسانے میں شہلا کہتی ہے۔

''یہ سمجھنے میں مجھے خاصا وقت لگا کہ سہیل اس مہارت سے جھوٹ بولتا تھا کہ دوسرے جھوٹ تک ان پر شک کرنے کا کوئی جواز نظر نہ آتا تھا اور اب سوچتی ہوں کہ اگر انہیں جھوٹ بولنے پر اتنا ملکہ حاصل نہ ہوتا اور میں ان کے جھوٹ کو سچ نہ سمجھتی تو شاید اتنے برسوں کا تناؤ جھیلنا میر بس سے باہر تھا''۔

شہلا اپنے شوہر کی ان حربوں و حرکتوں سے بہت تنگ آتی ہے اس سے پہلے کہ وہ خود بھی اپنے شوہر جیسی حرکتوں پر اتر آئے۔وہ اپنے آپ کو یہ سوچ کر روک لیتی ہے۔
''جلدی سے زینہ طے کر کے اپنی خوابگاہ کی پناگاہوں میں پہنچتے ہوئے میں یہ سوچ رہی تھی کہ آرزو کو تو کوئی نہ کوئی جواب مل ہی جائے گا۔۔۔۔۔اور خود مجھ۔۔۔۔ظاہر ہے کہ افسانے میں

ہمارے معاشرے کے ایک اہم مسئلے کو اُجاگر کیا گیا ہے جس نے اب ایک ناسور شکل اختیار کی ہے اس مسئلے نے ایک ایسی شکل اختیار کی ہے کہ اسے اب ''ہم جنس پرستی'' کی طرح صرف قانونی حیثیت ملنے کی دیر ہے۔ دوسری طرف ان جیسی مردوں کی بیویاں بھی پھر اسی چیز کی شکار ہوتی ہے اور ایک اچھے گھر کو بکھرتے ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ اور آج اسی ناسور نے سماج میں انتشار پھیلانے میں آگے ہیں۔ اور نا جانے کتنی خوشحال گھروں کو بکھر کر دیا۔ اور کتنے میاں و بیوی کی زندگی اجیرن بن گئی ہیں۔

جہاں تک اس افسانے میں نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں شہلا کا کردار واقعی فعال کردار ہے۔ یہ عورت کا فطری پن ہے کہ وہ مردوں کی بے رُخی برداشت نہیں کرسکتی۔ حالانکہ عورت کا صبر کا پیمانہ جب لبریز ہو جاتا ہے۔ تو برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔

افسانہ:۔شہر

کردار:۔امان۔انوار۔بابرا

چھوٹی بیٹی۔ثوبی۔اس کا بھائی

افسانہ ''شہر'' ترنم ریاض کا خاصا مشہور افسانہ ہے۔ترنم ریاض نے شہری زندگی کے مسائل پر جو افسانے لکھے ان میں نمائندہ مثال افسانہ ''شہر'' ہے۔

امان کو شہر آنے کی بڑی آرزو ہوتی ہے اور ایک دن اس کی یہ آرزو پوری بھی ہو جاتی۔ شہر میں آکر امان اور اس کی بیوی بابرا اور دو بچے ایک فلیٹ میں رہنے لگتے ہیں۔اصل میں امان اپنے دو بچوں کے ساتھ ''شہر'' کی رونق اور بچوں کے مستقبل کے پیش نظر قصبے سے اپنا تبادلہ'' شہر''میں کراتا ہے۔دو دن کے بعد وہ اپنے مرکزی دفتر کی ہدایت پر سائٹ پر چلا جاتا ہے اور تمام تر کوشش کے باوجود بروقت گھر واپس نہیں آپاتا ہے دو بچے اور ان کی ماں فلیٹ میں تھے اور وہ فلیٹ۔۔۔۔۔

''14 منزلہ عمارت کا سب سے اوپری فلیٹ تھا عمارت کی ہر منزل پر تین تین فلیٹ تھے،مگر سب سے اوپر والی منزل میں یہی ایک فلیٹ تھا۔کیونکہ ایک طرف ڈش انٹینا تھا اور دوسری طرف پانی کی ٹنکیاں۔۔۔درمیان میں یہ یک فلیٹ بن پایا تھا''۔۔۔۔۔

اس الگ تھلگ فلیٹ میں اور امان کی غیر حاضری میں اس کی بیوی کی موت ہوتی ہے امان کی بیوی کب مرگئی اس کے بچے جانتے ہیں کیونکہ دو دن سے اس کے فلیٹ میں کوئی نہیں

آیا اور نہ ہی بچوں کے ہاتھ دروازے کی چٹخنی تک نہیں پہنچ پاتے اور نہ ہی وہ مردہ اور زندہ میں فرق کر سکتے۔ اس شہر میں آئے ہوئے انہیں صرف ایک ہفتہ ہوا۔ جب بچوں نے ماں کو اس حالت میں دیکھا۔انہیں لگا کہ ماں سو رہی تھی اس کو ہلانے کی کوشش بھی کی۔ مگر وہ مردہ ہو چکی تھی اب بھائی جس کی عمر 5 سال سے زیادہ نہیں اپنی بہن کو رونے نہیں دیا بلکہ اپنی چھوٹی بہن کو کھانے کی الماری سے بسکٹ اور سیب نکال دیتے۔ بہن کو بھی کھلاتے اور تسلی بھی دیتے کہ ماں گہری نیند میں ہیں۔ جبکہ ماں کو مرے ہوئے دو دن ہو گئے تو بچے اب اپنی ماں کے قریب بھی نہیں جاتے کیونکہ اس کی شکل بدل گئی تھی یہ شکل کسی اور کی تھی۔

’میلے سے مٹیالے چہرے والی۔۔۔ان کی ممی تو گوری تھی‘

یہاں پر افسانہ نگار نے ان بچوں کی محرومی اور معصومیت کے حوالے سے ’’شہر‘‘ کی اس زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ جہاں نئے ذہن کے جوڑے جوائنٹ فیملی کو عذاب تصور کرتے ہیں اور شہری زندگی کی بے حسی دکھائی ہے ایک لاش دو دن سے کمرے میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے ہمسایوں کو پتا بھی نہیں اس طرح یہ افسانہ شہری زندگی پر جس میں جذباتوں کی اب کوئی قدر نہیں رہ گئی ہے اور ہر طرف مادیت ہے بلکہ سماج پر ایک بھرپور چوٹ ہے۔

اس افسانے کے متعلق مصنفہ کی رائے ہے’’ لکھنے کے بعد میں اس افسانے کو پڑھنے کی جُرات نہ کر سکی‘‘ کیونکہ یہ افسانہ ایک عجیب فضا پیش کرتا ہے ایک دلدوز کہانی ہے حقیقت یہ ہے کہ Alienation کے اس شہری تصور کو ترنم ریاض نے فن کاری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

وارث علوی اس افسانے کے متعلق لکھتے ہیں۔

''شہر ایک ایسا افسانہ ہے جس کے متعلق یقین نہیں آتا۔
کہ اس قسم کا افسانہ اُردو میں بھی لکھا جا سکتا ہے افسانے کا
ہر واقعہ ایک امریکی فلم کی مانند صاف شفاف طریقے پر آنکھوں
کے سامنے گھوم جاتا ہے امریکی فلم اس لیے کہا کہ اس افسانے میں
جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ امریکہ اور یورپ کے بڑے شہروں
کی رہائشی زندگی میں بہت عام نہ سہی لیکن ہوتے رہتے ہیں۔۔۔
۔۔'شہر' کے عنوان سے تو پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کا عندیہ جدید شہروں
کی بے چہرہ، بے حس اور اپنی انسانیت کھوتی جاتی آبادی پر طنز تھا''

اب یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تمام صورتحال کی ذمہ داری کس پر ڈالی ہے کیا افسانہ نگار نے قاری کے سامنے سوالات کھڑا کیے۔ یا وہ خود ان سوالوں کا جواب دے گی۔

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ ''شہر'' نہ صرف ترنم ریاض کا بہترین افسانہ ہے بلکہ اردو ادب کا سب سے بہترین افسانوں میں تصور کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

افسانہ:۔ بجھائے نہ بنے

نسائی کردار:۔ ریشماں ۔شنو

کردار:۔ چندو

اس افسانے میں ریشماں کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے ریشماں پنتالیس (45) چھیالیس (46) برس کی عورت ۔مگر دیکھنے میں اپنی عمر سے دس برس کم نظر آتی تھی ریشماں کئی برسوں سے محکمہ میونسپلٹی میں خاک روب تھی بچے ہوئے وقت میں وہ گھروں میں صفائی وغیرہ بھی کیا کرتی تھی محنت کش ہونے کی وجہ سے اکثر چاق وچوبند تھی دو برس پہلے جب دولت (اس کا خاوند) زندہ تھا اس کی کلائیوں میں رنگ برنگ چوڑیاں سجا کرتیں دل کھول کر اپنے لباس اور چوڑیوں پر خرچ کیا کرتی تھی ۔مگر دولت کے انتقال کر جانے کے ساتھ ہی وہ جیسے سجنا سورنا بھول گئی ۔ یہاں تک کہ بیس (20) یا بائیس (22) دن تو اُسے اپنا ہوش ہی نہ رہا۔ نہ گھر سے نکلی اور نہ کسی سے کچھ بولی ۔ پھر بیٹی (شنو) نے سمجھایا بجھایا اور آخر ریشماں نے اپنا وجود باہر کی طرف کھینچا اور جس دن وہ دوبارہ کالونی میں آئی تو کسی ہلکے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی ۔اس بار کلائیوں میں چوڑیاں نہیں ۔مگر اس سادگی نے اسے ایک الگ سا حُسن عطا کر دیا تھا ایسا لگتا جیسے وہ کوئی غیر شادی شدہ لڑکی ہے اب رفتہ رفتہ اس نے پہلے کی طرح باقاعدگی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ بلکہ کچھ گھروں میں بھی کام طے کر لیا کیونکہ اب ریشماں کو گھر جانے کی جلدی نہیں تھی کام میں مگن چپ چاپ شام ڈھلنے سے کچھ ہی دیر پہلے وہ گھر چلی جاتی اب گھر میں اس

کا کوئی انتظار کرنے والا نہیں۔ دولت تھا نہیں بیٹی سسرال لوٹ گئی۔ اس طرح کوئی دو برس بیت گئے۔ لیکن ریشماں کی جفاکشی میں کوئی فرق نہ آیا۔ پارک کے کونے کے سامنے ایک بڑی بلڈنگ تعمیر کی گئی اس بلڈنگ کے سارے فلیٹ میں ریشماں کو صفائی کرنی تھی جبکہ مالک مکان نے ایک چوکیدار بھی رکھ لیا جب تک فلیٹ بک جاتے چندو نام کا چوکیدار گاوں سے نئے وارد ہوئے جو چھبیس (26) ستائیس (27) سالہ نوجوان تھا۔ حالانکہ چندو کو کوئی کام نہیں تھا سارا سارا دن بلڈنگ میں بیکار سا گھوما کرتا جس کو کھانے کو کچھ نہیں تھا ریشماں اپنے پیسوں سے اُس کیلئے ضرورت کی چیزیں لے آئی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ چندو کیلئے کھانا بنا دیتی اس کے کمرے کی صفائی وغیرہ کیا کرتی۔ ریشماں خود چندو کے گھر میں ہوتی تھی۔ یا چندو اس کے یہاں۔۔۔۔۔۔

لیکن اچانک ایک دن شنو بیوہ ہوگئی ساس نے اُسے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا، تو شنو اب ماں کے گھر رہنے آئی اور حالات تیزی سے بدل گئے شنو نے ماں کا چندو سے میل جول دیکھا تو ماں سے بولنا کم کر دیا اور جب شنو نے یہ محسوس کیا کہ ماں اپنی کمائی چندو پر خرچ کر دیتی ہے تو ماں جھگڑنے لگی۔ ماں جھگڑنے کے برعکس جواب خاموشی سے دیتی جس سے شنو کو اور شک بڑھ گیا اور اب شنو نے اپنے ہی ماں کو کھُلے عام بدنام اور بے عزت کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اس کے محلے کی بوڑھی اماں اور باقی عورتوں نے ریشماں کو بات بات پر طعنہ دے کر چندو سے بیاہ کرنے کی باتیں کرتے ہیں اس افسانے میں نسائی نفسیات کے دو کردار ریشماں اور اس کی بیٹی شنو ریشماں جو دن کا بیشتر حصہ کام میں مگن رہتی۔

جبکہ اپنے جیب کے خرچے سے چندو کیلئے ضرورت کی چیزیں خرید کر لا دیتی ۔ یہاں پر سوال کہ ریشماں پنتالیس سال کی خاتون ایک چھبیس سال کے نوجوان پر رحمدل کیسے بنتی ۔شاید یہ ممتا ہی رنگ ہوگا۔۔۔۔۔اور بیٹے کی متمنی رہی ہوگی ریشماں ۔

لیکن بیٹی کو ماں پر شک واجب بن گیا۔ جب بیٹی ماں سے سوال کرتی کم بولنا جھگڑا وغیرہ تب بھی ماں خاموشی اختیار کر بیٹھی ایسا کیوں ۔؟؟۔۔۔ یہاں پر بیٹی کا شک واجب ''چندو'' جس کی عمر ریشماں سے کہیں زیادہ کم تھی ۔۔۔۔۔۔

افسانہ:۔ برف گرنے والی

نسائی کردار:۔ حاجرہ۔ جاوید کی ماں، یاسمین۔ جاوید کی چھوٹی بہن۔

کردار:۔ جاوید احمد، خضر محمد۔ جاوید کا باپ۔

''افسانہ'' برف گرنے والی'' اصل میں ''مصیبت آنے والی'' یہ کہانی ایک ایسے گھرانے کی جس میں کم عمر بیٹا جاوید قالین بنانے کا کام کرتا تھا خواجہ صاحب کی فیکٹری میں۔ مگر بدقسمتی سے سرکار نے بچوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کردی اور سماجی کارکن ان فیکٹریوں میں گھوم رہے ہیں جس کی وجہ سے خضر محمد کے خاندان غربت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے کیونکہ تنہا خضر محمد کی محنت سے ان چار افراد کا گزارہ نہیں ہوسکتا اب باپ جاوید احمد کو کوئی ضروری کا کام کرنے کو کہہ رہے ہیں لیکن دوسری طرف ایک اور شخص ''خلیل جو'' نے جاوید احمد کو بہکایا کہ ایسا کام بھی جس میں پیسہ ہی پیسہ ملے گا لیکن یہ کام بقول خلیل جو ثواب ہے کچھ ہو گیا تو شہادت نصیب ہوگئی۔ مگر کم سن جاوید یہ کام کرنے کیلئے آمادہ ہو گیا۔ چونکہ باپ کو پتا ہے کہ خلیل جو اُس کے بیٹے کو کونسا کام دے گا۔

بقول باپ

''ارے نہیں بیٹا۔ خدا نہ کرے کہ تم کوئی ایسا کام کرو''

ایسا سوچنا بھی مت۔

اصل میں بیٹا حالات سے لڑنے کیلئے تیار رہتا ہے، اور اس کے برعکس باپ یہ سوچتا کہ ابھی حالات سدھریں گے جلدی کیا ہے۔ اس کے خیال میں پریشانیاں تھوڑے دنوں کی

ہیں۔اصل میں مصنفہ نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی صرف زندہ رہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے اگر آدمی کو بھوک لگی ہو تو آدمی چوری تو کیا دوسرے خراب کاموں کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہے اور یہاں تک کہ دنیا کے بہت اچھے اصولوں کو توڑ دینے سے ڈرتا بھی نہیں۔

یہ کہانی اپنا درد خود بیان کرتی ہے باپ اور بیٹے کا یہ کردار اس کہانی کا پس منظر بنتا ہے۔ یہاں باپ کا کردار سست، کاہل، اور آلسی ہے۔جس نے گھر کا بوجھ اپنے کم عمر بیٹے پر ڈالا ہے۔ اور اپنے مسئلوں کو مقدر کے سپرد کر کے خاموش بیٹھ جاتا ہے۔جبکہ بیٹا آج کے حالات بنتے، بگڑتے تصورات اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہی نہیں رہتا۔ بلکہ اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈال کر اپنے گھر والوں کی پرورش کے بارے میں سوچتا ہے کہ اب زیادہ دن ہم اور بھوکے نہیں رہ سکتے۔

ایک اقتباس دیکھتے ہیں۔

نہ میر لعل۔ ہمارے پیٹ کیلئے اپنی زندگی مت بیچنا

بھوکی جی لوں گی تمہیں کھو کر زندہ نہ رہ پاؤں گی میرے بچے۔

یہ افسانہ ایک طرح سے دو نسلوں کی کہانی ہے۔ایک نئی بنتی ہوئی نسل جو زمانے کو چیلنج سمجھ کر اس کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوتی ہے۔اور دوسری تھکی ہوئی پرانی نسل ہے جو حالات کا مقابلہ نہ کر سکنے کے باعث پیچھے ہٹتی جاتی ہے۔

اگرچہ اس کہانی میں یہ بات کہیں سے راست طور پر نہیں کہی گئی ہے مگر چونکہ ترنم

ریاض خود بھی کشمیری ہیں۔ عجیب بات نہیں ہے کہ کہانی کشمیر میں ہونے والے حالات سے بھی وابستہ کر کے پیش کی گئی ہو اگر ایسا ہے تو یہ کہانی کا ایک نیا رخ بھی ہوسکتا ہے جن حالات سے وہاں کی زندگی گزر رہی ہے۔ اس میں ایسا تیکھا پن پیدا ہو جانا کچھ دور نہیں۔

''برف گرنے والی'' میں جہاں تک نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں جاوید کی ماں حاجرہ۔ جو اپنے بیٹے جاوید کی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی ہے ماں کی ممتا اس طرح اُبھری کہ ہم بھوک کو برداشت کریں گئے لیکن بیٹے کی زندگی کو جوکھے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔

''کون ماں نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ پڑھے لکھے گئی۔ مگر وہ کیا جانیں بھوک کیا ہوتی ہے''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

شیرنی

نسائی کردار:۔ نجمہ، گاوں کی لڑکی

بی بی جی:۔شہر کی ایک فلیٹ میں رہنے والی۔

افسانہ ’’شیرنی‘‘ ایک اسے لڑکی کی کہانی ہے جو جنگل کے دامن میں رہتی ہے اور رات کے اندھیرے میں بنا ڈر وخوف کے اکیلی چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ نجمہ کی شادی دو تین برس میں ہونے والی تھی ۔لیکن اس کی بہادری اور سادگی نے مصنفہ کا دل اس طرح جیت لیا کہ ان کے والدین سے اسے ان دو تین سالوں کیلئے مانگ لیا۔ ایک دن مصنفہ جب کسی تقریب میں شرکت کیلئے اُس کے گاوں گئی تھی ۔شہر سے آئے مہمانوں کی سکونت کا انتظام وہاں کے ڈاک بنگلے میں کیا گیا جو جنگل کے دامن میں واقع تھا اور پھر رات کے اندھیرے میں ایک دفعہ جب مصنفہ کسی آہٹ سے بیدار ہوئی۔تو کھڑکی سے دیکھا کہ کوئی طویل قامت لڑکی تھی جو ہاتھ میں لال ٹین لیے پھاٹک کی طرف جارہی تھی۔ پہلے پہل مصنفہ کو سمجھ نہیں آیا، کہ یہ کوئی انسان یا کوئی جانور/ بھوت، مگر آہستہ آہستہ اسکو پتہ چلتا کہ یہ کوئی نہیں بلکہ نجمہ جو رات کے اندھیرے میں ایک بلا کو مارنے کیلئے کھڑا ہو کر اسکا تعاقب کر رہی ہے۔ جو اصل میں کئی دنوں سے اسکے مرغیوں کو کھائے جارہا تھا اسکی بہادری پر مصنفہ یہ کہتی ہے کہ ایسا یقینی طور پر وہ لوگ کر سکتے ہیں ۔ جو بغیر کسی ڈر کے زندگی گزار سکتے ہیں ۔مگر مصنفہ واپس اس کا دھیان اس کی کمزوری اور لاچاری پر ڈالتا کہ جب وہ اسکو اپنے شہر میں لے کر چلی جاتی ہے۔ جہاں پر وہ ہر کوئی کام بنا ڈر

کے کرسکتی ہے۔ جو سنسان سڑکوں پر آرام سے چل سکتی مگر اچانک مکان (Flat) کے غسل خانے میں چلی گئی تو وہاں آواز سنائی جس سے وہ ڈر گئی ۔ جب ادھر اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا اس آواز نے جنگل کی شیرنی لڑکی کو اس طرح ڈرایا کہ وہ کچھ بول بھی نہیں سکتی ۔ جہاں تک اس افسانے میں نسائی نفسیات کا تعلق ہے اس میں نجمہ شہر میں رہنے والے لوگوں کی آواز کو سن کر ڈر گئی۔ جبکہ وہ جنگل میں رات کے ڈراونے اور سنسان ماحول میں اکیلی گھوما پھرا کرتی تھی ۔مگر یہاں کے لوگوں سے وہ زیادہ ڈرتی تھی ۔ جیسے کہ مکان کے غسل خانے میں مونچھ والے لڑکے کی آواز سے ڈر گئی اس افسانے میں مصنفہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ بہادر لڑکی جنگل کے جانوروں سے نہیں بلکہ شہر کے لوگوں سے ڈرا کرتے ہیں۔

میرا پیا گھر آیا

نسائی کردار:۔شمع

کردار:۔شہیر

تاجدار حرم ہونگاہ کرم۔ہم غریبوں کے دن کب سنور جائیں گئے

آپ کے در سے خالی اگر جائیں گے۔

اس افسانے ''میرا پیا گھر آیا'' میں دو کردار پائے جاتے ہیں۔ایک شمع کا یعنی عورت کا اور شہیر مرد کا اور انکی چھوٹی سی معصوم کلی ''منی'' یہ افسانہ نسائیت اور سماجی حقیقت پر مبنی دکھایا گیا ہے۔ جس میں عورت کو اصل میں ایک گھر کی نوکرانی اور بچوں کی پرورش کرنے والی کے سوا کچھ نہیں اور ساتھ ہی اسکو ہر وہ کام کرنا پڑتا ہے، جو اسکو سونپا دیا جاتا ہے۔جس سے عورت پسند کرے یا نہ کرے اس افسانے میں پہلے شادی کے بارے میں اختلافات یعنی شہیر اکثر اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔کہ ہمیں بہت سے رشتے آتے ہیں۔اور ہم زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔اور آپ جیسے خاندان سے کوئی دلچسپی نہیں۔مگر تقدیر کو کون بدل سکتا۔یعنی عورت کو ہر وقت طعنہ دیا جاسکتا ہے گو یہاں پر سماج زندگی کی یکسانیت نہیں ہوتی اس مردانہ سماج میں، اور دوسری طرف عورت کو صرف گھر کی نگہداشت اور کھانا پکانے کے کام لئے جاسکتے ہیں اور یہاں تک کہ اگر کسی قسم کی کوطائی پائی جائے۔تو بات بات پر ڈانٹ پڑتی ہیں۔اس افسانے میں ایک جگہ'' نمک'' کا اشارہ دیا جاتا ہے۔کہ آپ نے نمک کی ڈبی کہاں رکھی۔جبکہ وہ ڈائینگ ٹیبل Dinning Table پر گلدان کے ساتھ ہی تھی۔

پھر بھی شہیر کو لگا کہ اس نے میرے من کے خلاف رکھا ہے۔ دوسری طرف اس افسانے میں سماجی بدعت پر رقم پذیر ہے کہ عورت کو گھر کے معاملات میں مداخلت کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی اس کے برعکس مرد جہاں چاہئے جا سکتا۔ کوئی بھی روکنے والا نہیں ہوتا اس کے برعکس عورت پر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شمع کو جب شہیر کی شادی شدہ زندگی سے کہیں سکون واطمینان نہیں ملا۔ تو وہ روحانی سکون کی تلاش میں نکل پڑی یعنی شادی کے بعد شہیر آدھی آدھی رات کو گھر لوٹتا نشے کی حالت میں بدزبان اور بدسلوکی سے پیش آنا۔ جیسے حرکات سے شمع پہلے پہل پوچھا کرتی تھی ہر بات پر سوال کرتی اور یہاں تک کہ رات دیر گئے تک شہیر کا انتظار کرتی آخر کب تک شمع اس کے انتظار میں اور یہ ساری حرکات وسکنات دیکھتی رہیں۔ مگر یہ سب کچھ شمع نے سہہ لیا۔ صرف اپنی معصوم بیٹی 'منی' کی خاطر۔ جب اس زندگی سے اِسے چین وسکون نہ ملا۔ تو وہ روحانی سکون کی تلاش میں خواجہ کے درگاہ پر جاتی رہتی ایک دن جب شہیر نے شمع کو لذیذ کھانا پکاتے دیکھا۔ سجتے، سنورتے باہر نکلتے دیکھا۔ تو وہ شک وشبہہ کر بیٹھا کہ کس سے ملنے جا رہے ہو۔ کون ہے وہ جس سے تم ملنے جا رہے ہو۔ حالانکہ شمع نے کوئی بحث نہیں کی سوال کا جواب نہ دیا۔ اور ''منی'' کو ساتھ لے کر درگاہ کی طرف چل پڑی۔ وہاں قوالی کی موسیقی سے دل کو سکون ملا۔

اور ذہنی دباؤ ہلکا ہونے لگا۔ اور قوالی کو غور سے سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ عصر کی اذان ہوئی۔ درگاہ میں نماز پڑھنے کے بعد اس کا دل ودماغ ہلکا ہونے لگا اور چین وسکون پایا اور واپس گھر کی طرف نکلی جہاں تک نسائی نفسیات کا تعلق ہے کہ شمع کو بات بات پر طعنہ اور شک وشبہہ کی

نگاہ سے دیکھا جاسکتا۔ حالانہ وہ روحانی سکون حاصل کرنے کیلئے صرف جمعرات کو درگاہ پر نماز پڑھنے کیلئے جاتی۔ تب بھی اس پر نہ جانے کتنے سوالات کیے جاتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس اس کا شوہر آدھی آدھی رات کو گھر لوٹتا۔ نشے کی حالت میں اوراس کے باجود بھی نہ جانے کیا کیا طعنے دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دفتر جا کے دن میں ہزار بار گھر کو فون کرتا۔ کہ آیا شمع گھر پر موجود ہے کہ نہیں ایسا حق صرف مردوں کو ہے کہ جو چاہئے۔ جیسے چاہئے زندگی بسر کریں ۔عورتوں کو آزاد زندگی جی لینے کا کوئی حق نہیں۔ خاص کر شادی شدہ زندگی میں۔ ترقی یافتہ سماج پر ایک سوالیہ نشان ہے اوراس سماج میں رہنے والے ایسے اشخصاص پر جن کی بیویاں گھر گرہستی اچھی طرح سے سنبھال بھی لیتی ہے۔۔۔۔؟؟

غرض ترنم ریاض اُردو افسانے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہے۔ بلا شبہ وہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہے۔جس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔جس میں نہ کوئی بناوٹ وساخت اور نہ ہی کوئی اکہرا پن۔ بلکہ نسوانی جذبات واحساسات کو جہاں ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں لطافت وشگفتگی سے پیش کیا ہے۔ وہیں زندگی کی آفاقیت اوراس کی رنگا رنگی کو فطری ارتقاء کے تناظر میں بھی دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں اپنے جذبات ومشاہدات اور تلخ تجربات کو تخلیقی طرح دینے میں وہ بڑی بے باک بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ ترنم ریاض کی زندگی سے گہری وابستگی کا احساس ان کے افسانوں میں بار بار ابھرتا ہے۔ ان کے افسانے عہد حاضر کے واقعات کا عکس پیش کرتے ہیں۔جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کہانیاں محض روایتی ڈھنگ سے باتیں بنا کر پیش کی گئی ہیں۔ بلکہ مصنفہ نے کہانی کی گہرائیوں میں اتر کران کیفیات کو پیش کرنے کی کوشش کی

ہے جس سے تاثر پڑھنے اور سننے والے دونوں کو اپنی کیفیت میں لپیٹ لیتا ہے۔

ترنم ریاض نے جہاں عصری حالات میں پامال ہوتی انسانی اقدار اور سفاکانہ قوتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ تو وہیں وہ فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی اور اس کی لا حاصل تمناؤں کا ذکر بھی نہایت و متاثر کن انداز میں اس طرح کرتی ہیں۔ کہ یہ ہر شخص کو اپنی زندگی کی یاد میں تڑپانے لگتی ہیں اُردو کے نئے کہانی کاروں میں ترنم ریاض بے حد حساس، باریک بین، اور مسائل کو سمیٹ کر اپنی کہانیوں میں پیش کرنے کا بہت اچھا سلیقہ رکھتی ہیں۔ شاید آج اُردو کی خواتین کہانی کاروں میں خاص طور پر حالات، مسائل اور انسانی زندگی کی دھڑکنوں کو گرفت میں لینے کا فن ان کے جیسے منفرد اور شفاف انداز میں شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو اس کے اظہار کا بہترین نمونہ ان کی کہانی 'شہر' اور 'مٹی' ہے مگر نئی کہانیوں میں اس طرح کی پکڑ اور حساسیت آج بہت کم کہانی کاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہانیوں کا تجزیہ کرتے وقت ترنم ریاض کے فن اور خاص طور پر کہانی بننے کے آرٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترنم ریاض کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں کہانی پن کہانویت خاصی اچھی ہے۔ جو زبان کے استعمال میں نہایت سلجھی اور سنجیدہ افسانہ نگار تصور کی جاتی ہے۔ ان کے یہاں افسانوی کائنات میں مقامیت اور مقامی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی ان کے افسانوں کا ابتدائیہ و خاتمہ خاتمہ چونکا دینے ولا ہوتا ہے۔ اور افسانے کی تکنیک کی ترجمانی پیش کرتا ہے۔ خاص طور سے ان کا اسلوب بیانیہ اور فنی رکھ رکھاؤ انہیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

طاریق چھتاری اُن کی افسانہ نویسی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے (شعروحکمت) میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ترنم ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے بیش تر کردار و واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر فہم و دانش سے لبریز ہو جانے والے دل پھوٹتی شعائیں اس کے ذہن کو منور کر دیتی ہیں اور خود کو افسانے کا ایک کردار سمجھ کر افسانہ نگار کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ فن کی معراج ہے اس کی کسوٹی پر ترنم ریاض کے افسانے پورے اترتے ہیں''۔

الغرض ترنم ریاض کے ان افسانوں میں نسائی نفسیات کو ڈھونڈنا خاصا مشکل ہے کیونکہ انسانی نفسیات کی تہہ تک پہنچنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے پھول میں خوشبو کو تلاش کرنا اور بعض اوقات ایسا بھی ہے جیسے کسی جرم کی تہہ تک مجرم کو شدید قدم اُٹھانے پر مجبور کیا ہو۔ محبت کی بھی ایک نفسیات ہیں۔ اور جب سے دنیا بنی ہیں غالباً اسی ایک موضوع پر زیادہ لکھا گیا ہوگا۔

باب چہارم

حاصلِ مطالعہ

حاصل مُطالعہ

عورت نصف انسانیت ہے۔ جو قدرت کا بھیجا ہوا نہایت حسین تحفہ ہے۔ یہ جو کائنات کے رنگوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ سماج میں مرد کیلیے اس کی مردانگی باعثِ شرف ہے۔ نہ عورت کیلیے اس کی نسوانیت باعث عار ہے۔ یہ دونوں انسان کی حیثیت سے اپنی خلقت اور صفات کے لحاظ سے فطرت کا ایک عظیم شاہکار ہیں۔ مرد انسانیت کے ایک حصہ کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے حصہ کی ترجمانی عورت کرتی ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کیلیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے بغیر بلکل نامکمل ہیں۔ کہ عورت کا تخیل مرد کے خیال سے اور مرد کا تخیل عورت کا خیال سے آزاد ہوا ایسا اس لیے ممکن ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر زندگی کے حسین لمحوں کو خوشگوار بناتے ہیں۔ انسانی معاشرے میں عورت کی حیثیت غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کی عورت محسوس کرتی ہے کہ عورتوں کے ساتھ کسی نے بھی انصاف نہیں کیا۔ ان کے حسن و جمال، جسمانی قوت اور ذہانت ہی نہیں بلکہ ان کی قدرتی کمزوریوں کو بھی بنیاد بنا کر ان کا استحصال کیا گیا۔ اور یہ آج کے سیاسی اور نفسیاتی حالات کا نتیجہ ہے جس سے آج کا پورا سماج دوچار ہے۔ معاشرتی زندگی میں عورت بحیثیت ماں، بیوی کے باوجود عورت کے مختلف تعمیری کردار نہ صرف مشکوک ہو کر رہ گئے بلکہ اس کو انتہائی پست مخلوق کی صف میں رکھا گیا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سماجی و معاشرتی سطح پر عورت کے ساتھ بے شمار زیادتیاں اور نا انصافیاں ہوتی رہی ہیں۔ گھریلو تشدد، زدوکوب، جنسی استحصال، ریپ اور جہیز کی وجہ سے نہ جانے کتنی عورتوں کا

جنازہ اُٹھتا ہے اوراسطرح کے واقعات عورت کے ساتھ آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔سماجی وسیاسی سطح پر آج بھی گاوں اور چھوٹے شہروں میں بعض حقوق جو مردوں کو حاصل ہیں۔وہ عورت کو حاصل نہیں ہیں۔

اس کے برعکس خواتین نے جب باقاعدہ قلم سنبھالا اورلکھنا شروع کیا تو تخلیقی سطح پر اپنی فکرو احساس کی ایک دنیا بسادی۔اگرچہ اس کے لئے ابتدا میں انھیں اپنی شناخت چھپانی پڑی۔اگرچہ پدری نظام منفی امتیازات،تعصّبات کی جڑوں کوادب کے ذریعے سے ختم کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں،جس سے عورت کی حیثیت اوراس کی خودمختاری کو لے کر ادب میں ایک نیا ڈسکورس شروع ہوا۔جس کے نتیجے میں نسائی فکر وشعور کے انتہائی انوکھے رنگ نمایاں ہونے لگے۔عہدرواں کےنسائی ادب کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ادب میں تعلیم یافتہ، باشعور اور مکمل طور پر بااختیار عورت آنے لگی ہے۔

موجودہ حال میں خواتین کی لکھی تحریروں کا جائزہ لیے جانے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ خواتین کا ''نسائی ادب'' ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اہمیت کا حاصل رہا ہے۔

جہاں تک جموں وکشمیر میں نسائی ادب کا تعلق ہے اوراُسمیں افسانوی ادب کی بات ہے تو یہ سفر بھی کچھ سُست رفتاری کا شکار رہا ہے۔اس میں بھی اکثر اوقات وہی ہوتا رہا کہ نسائی ادب کو کمتر گردانا جاتا رہا۔مگراب ہمارے ہاں ادب عالیہ کی تخلیق میں خواتین کا قابل لحاظ حصہ ہے۔اور ریاست جموں وکشمیر میں جن خواتین نے اُردو شعر وادب میں نہ صرف ریاستی بلکہ مُلکی سطح پر اپنا مقام اور پہچان قائم کی ہے ان میں ترنم ریاض کا نام سرفہرست ہے۔جنہوں

نے اُردو افسانوی ادب کی روایتی اقدار کا خیال رکھتے ہوئے جدید تر رجحانات کا بھی خیر مقدم کیا ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کے مسائل اور نفسیاتی اُلجھنوں، احساسات و جذبات، تجربات و مشاہدات کے علاوہ مرد اساس سماج میں عورت کی حیثیت و اہمیت اوراس پر ہورہے ظلم وستم کے برملا اظہار کو اپنے افسانوی کا موضوع بنایاہے۔ وہ جہاں ازدواجی زندگی پر لکھی گئی کہانیوں میں ایک ماہر نفسیات کی طرح باریک نکتوں پر فلسفیانہ بحث کرتی نظر آتی ہیں وہیں طبقاتی کشمکش،عصری انتشار اوراس سے پیدا شدہ صورت حال کو کہانی لکھنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ظلم و جبر اور تشدد کے منظر میں لکھیں گیئں اُن کی کہانیاں کسی آشوب نامے سے کم نہیں۔ایسے حالات میں واقعی وہ ایک ذی حس فنکار کی صورت میں نہ صرف تمام درد وکرب جھیلتی ہیں بلکہ ایسے فن پاروں کے مطالعے سے قاری کے دل ودماغ میں بھی ایک ٹیس اُٹھتی ہے۔

ترنم ریاض اُردو فکشن کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہیں۔ان کے یہاں کہانی پن اور کہانویت کا بھر پور اظہار ہے۔ وہ زبان کے استعمال میں نہایت سلجھی اور سنجیدہ فکشن نگار تصور کی جاتی ہیں۔ان کی افسانوی کائنات میں مقامیت اور مقامی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ترنم ریاض ریاست جموں وکشمیر کی سب سے مشہور اور ایواڈ یافتہ فکشن نگار خاتون ہیں جنہیں اپنی شعری کائنات، ناولوں اور افسانوں کی بناء پر جو شہرت اُردو دنیا میں ملی۔ وہ کئی اعتبار سے قابل غور ہے۔ریاست کی خواتین فکشن نگاروں میں شاید ہی کسی اور فکشن نگار کو اتنی جلدی ادبی حلقوں میں اس درجہ پذیرائی حاصل ہوئی ہو جتنی کہ ترنم ریاض کو ملی۔اور اتنا ہی نہیں،

بلکہ اُردو کے ناقدین خصوصاً گوپی چند نارنگ، وارث علوی جیسے ناقدین نے اُن کے فن کو سراہا اور اُن پر لکھا۔

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں روزمرہ کے خیالات کو بہترین زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔ادب انسانی زندگی کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔انسان دنیا میں جن تجروبات ومشاہدات سے گزرتا ہے اس کے ردعمل کا اظہار وہ ادب کی شکل میں کرتا ہے۔شاید ہی وجہ ہے کہ ادب انسانی زندگی کے وسیع ترین مسائل کا احاطہ کرتا ہے

ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں الفاظ اس منظّم ومرتب طریقے سے استعمال ہو کہ پڑھنے والا بے ساختہ محزوز ہو مگر یہ لذت تبھی حاصل ہوسکتی ہے جب لفظ اور اس کے معنی اور مفہوم اور عبارت میں رس گھولیں (مٹھاس پیدا کریں) اور یہی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے لیکن یہ رس و مٹھاس اور انبساط ہم اُسی وقت محسوس کرے۔جب ہمارے باطن میں چھپے ہوئے احساس کو مسرت حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ یہ وہ تحریر ہوگی جس نے ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں کے خزانے میں اور اضافہ کیا ہو۔

الغرض ادب ایک چمکتا ہوا سورج ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں کا ہونا ضروری ہے۔بعض اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہوجاتے ہیں لیکن سچا اور پائدار ادب وہی ہے جس میں حرارت بھی ہو ورنہ خالی چمک دمک چاند کی روشنی کی طرح محض خالی اور شرارہ کی چمک کی طرح وقتی ہوتی ہے۔حرارت کا تعلق ادیب کے دل ودماغ سے ہوتا ہے۔چمک کا تعلق اس کے فن سے۔جبکہ نفسیات انسان اور انسانی زندگی کا وہ مطالعہ ہے کہ تمام علوم وفنون کی بنیاد اسی پر منحصر ہے۔نفسیات کو بطور علم اور سائنس سامنے آئے ہوئے ابھی صدی ہی مکمل ہوئی ہے۔

اس لیے ادب سے اس کی عمر کا موازنہ ممکن نہیں ۔لیکن نفسیات کے زیر بحث جو موضوعات آتے ہیں ان کا تعلق انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ ادب اور نفسیات کا تعلق چولی دامن کا ہے۔ادیب نے نفسیاتی نظریات اور نفسیاتی تحقیق کا مطالعہ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن وہ انسان کے مشاہدے، تجربات اور احساسات کا باریکی سے مطالعہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے اور ایک کا دوسرے پہ مرتب اثرات کا جائزہ لینا ہی نفسیاتی تنقید کا حصہ ہے۔ادب پاروں کے زریعے ادیب کی شخصیت اور ادیب کی شخصیت کے ذریعے ادب پاروں کا تجربہ ایک دوسرے کیلئے Complementary رہے ہیں۔ ادب کا اصل موضوع انسان اور اس کی ذات ہے۔اور انسان اپنے اعمال اور افعال میں ہر لمحہ عقل اور شعور کے اشارے پر نہیں چلتا بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی وہ کسی نفسیاتی تحریک یا جذباتی عمل سے متاثر ہو کر کسی چیز کی طرف راغب ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب انسانی تجربوں کی عکاسی کرتا ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی نقطہ نظر سے ادب کے مطالعے میں ایک طرف تو لکھنے والے کی نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے اور دوسری طرف جو کچھ اس نے پیش کیا ہوتا ہے۔اس پر اس حثیت سے نظر رکھنا لازمی ہے کہ جو پیش کیا گیا ہے وہ نفسیاتی حیثیت سے قابل قبول ہے یا نہیں۔

الغرض ترنم ریاض اُردو افسانے کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہیں۔ بلا شبہ وہ ایک معتبر اور سنجیدہ دل کی آواز ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔جس میں نہ کوئی بناوٹ وساخت اور نہ ہی کوئی اور نہ ہی کوئی اکہرا پن۔ بلکہ نسوانی جذبات واحساسات کو جہاں ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں لطافت وشگفتگی سے

پیش کیا ہے۔ وہیں زندگی کی آفاقیت اور اس کی رنگارنگی کو فطری ارتقاء کے تناظر میں بھی دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں۔ اپنے جذبات ومشاہدات اور تلخ تجروبات کو تخلیقی طرح دینے میں وہ بڑی بے باک بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ ترنم ریاض کی زندگی سے گہری وابستگی کا احساس ان کے افسانوں میں بار بار ابھرتا ہے۔ ان کے افسانے عہد حاضر کے واقعات کا عکس پیش کرتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی کہانیاں محض روایتی ڈھنگ سے باتیں بنا کر پیش کی گئی ہیں۔ بلکہ مصنفہ نے کہانی کی گہرائیوں میں اتر کر ان کیفیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن کا تاثر پڑھنے اور سننے والے دونوں کو اپنی کیفیت میں لپیٹ لیتا ہے۔

ترنم ریاض نے جہاں عصری حالات میں پامال ہوتی انسانی اقدار اور سفاکانہ قوتوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا تو وہیں وہ فطری طاقتوں کے آگے انسان کی بے بسی اور اس کی لا حاصل تمناؤں کا ذکر بھی نہایت ومتاثر کن انداز میں اس طرح کرتی ہیں کہ یہ ہر شخص کو اپنی زندگی کی یاد میں تڑپانے لگتی ہیں۔ اُردو کے نئے کہانی کاروں میں ترنم ریاض بے حد حساس، باریک بین، اور مسائل کو سمیٹ کر اپنی کہانیوں میں پیش کرنے کا بہت سلجھا ہوا سلیقہ رکھتی ہیں۔ شاید آج اُردو کی خواتین کہانی کاروں میں حاص طور پر حالات، مسائل اور انسانی زندگی کی دھڑکنوں کو گرفتار میں لینے کا فن ان کے جیسے منفرد اور شفاف انداز میں شاید ہی کسی نے پیش کیا ہو۔ اس کے اظہار کا بہترین نمونہ ان کی کہانی (شہر اور مٹی) ہے مگر نئی کہانیوں میں اس طرح کی پکڑ اور حساسیت آج بہت کم کہانی کاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نئی کہانی کاروں کا تجربہ کرتے وقت ترنم ریاض کے فن اور خاص طور پر کہانی بننے کے آرٹ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اگر چہ آج کی جدید تہذیب میں عورت بھلے ہی اپنے سارے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اور مردانہ بالا دستی والے سماج میں اپنی اہمیت اور تشخص قائم کرنے میں کامیاب تو ہوئی۔ پھر بھی آج عورت کے سامنے نئے طریقے کے مسائل اور نیا استحصال ہیں۔ اب عورت خانگی امور میں اُلجھی رہتی ہے۔ ملازمت کی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہے۔ اور یہاں تک کہ عورت کو اب مردوں کی کمینی ذہنیت نے عریاں اشتہاری بازار میں لا کھڑا کیا ہے۔ جہاں وہ جسمانی نمائش کرنا اپنی شان سمجھتی ہے۔

عالمی ادب کی طرح اب اُردو ادب میں بھی عورت اپنے جذبات و احساسات اور فکر و خیال کا اظہار اپنے مخصوص نسائی لب و لہجے میں کر رہی ہے۔ اب وہ شعر و ادب میں مرد سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں ہے۔ وہ بڑے ہی بے باکانہ انداز میں مردوں کی کمزوریوں اور اُن کے فریب و مکاری کو اپنی تخلیق میں بے نقاب کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کائنات میں اگر خوبصورتی ہے تو وجود زن سے ہے۔

''At last Taranum Riyaz's key themes are urban poverty and the big city's inhumanity''

موجودہ تحقیقی کام کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ابھی تک ترنم ریاض پر زیادہ تحقیقی کام نہیں ہوا اور خاص کر افسانوی مجموعوں پر۔ اگر چہ اُن کے ناول ''برف آشنا پرندے'' میں کشمیر کی ثقافت، یہاں کے جغرافیائی حالات و کیفیات کا پورا بیان ملتا ہے پھر بھی تحقیق کے حوالے سے اس کو وہ اہمیت نہیں ملی جس کا اسے حق ہے۔

میں اپنی اس تحقیق میں ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے ابابیلیں لوٹ آئیں گی کے تجزیے اوران افسانوں کی نسائی نفسیات کے تحقیقی مطالعے کے بعداس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ترنم ریاض کے فن اورفن پاروں کی تحقیق اوران کے معیار و وقار کے تعین میں ادب کے ماہرین کے ذریعے بہت کچھ بیان کیا جاچکا ہے۔تاہم معاصر تناظر میں ترنم ریاض اوراُن کے فنکارانہ معیار اورفن پاروں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح سورج کی مانند عیاں ہے کہ میرے اس انفرادی مطالعے کی نتیجہ خیزی کے باوجود نئی راہیں کھلتی اور نکلتی رہیں گئی اور ترنم ریاض کے عورت کے تخلیق کارانہ احساس وادارک کی نئی پرتیں سامنے آتی رہیں گی۔ وہ یقیناً ایک بلند قامت نسائی نفسیات کے طور پر جانی اور پہچانی جائیں گی۔اُمید ہے کہ اُن کا قلم روزافزوں اور برجستہ اور اوربھی گہرے مشاہدات سے ہمیں مشرف بہ نیاز کرتا رہے گا۔

کتابیات

کتابیات

۱۔ اشرفی وہاب ''مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات''،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۴۔
۲۔ اختر ڈاکٹر سید جاوید''اُردو کی ناول نگار خواتین''،بسمہ کتاب گھر دہلی،۲۰۰۵۔
۳۔ اختر ڈاکٹر سلیم ''تنقید دبستان''،بک کارپوریشن دہلی، ۲۰۰۹
۴۔ احمد ڈاکٹر شمیم،محمد اظہر امین''کشمیر کے تیرہ اُردو افسانے'' ایم۔آر پبلی کیشنز،۲۰۱۴۔
۵۔ احمد کلیم الدین ''تحلیل نفسی اور ادبی تنقید (ترجمہ)''،۔۔۔۔۔۔۔
۶۔ بیگم صالحہ''ہندوستانی سماج میں عورت کی اہمیت (مضمون)''،،ماہنامہ آجکل ۲ ۱۹۷۔
۷۔تحسین ڈاکٹر آمنہ''تانیثی فکر کی جہات (تحقیقی وتنقیدی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ)''
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،۔۔۔
۸۔ ٹاک محمد اشرف شیرازہ''ہمعصر افسانہ نمبر''،کلچر اکیڈمی جموں وکشمیر،۱۲۔۲۰۱۱۔
۹۔ٹاک محمد اشرف شیرازہ۔''جموں وکشمیر میں اُردو نثر''،کلچر اکیڈمی جموں وکشمیر،
۱۰۔ جالبی ڈاکٹر جمیل ''ادب کلچر اور مسائل''،،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،۲۰۰۲۔
۱۱۔ حسن سید محمد''ابتدائی نفسیات''،قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی،۲۰۱۴۔
۱۲۔ حنا زائدہ ''عورت زندگی کا زندان''،تخلیق کار پبلشرز لکشمی نگر دہلی،۲۰۰۶۔
۱۳۔ ریاض ترنم 'ابابلیں لوٹ آئیں گی' افسانوی مجموعہ نرالی دُنیا پبلی کیشنز نئی دہلی،۲۰۰۰
۱۴۔ ریاض ترنم ''اجنبی جزیزوں میں''،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی،۲۰۱۵۔

۱۵۔ ریاض ترنم ''برف آشنا پرندے''، بک کارپوریشن دہلی، ۲۰۱۰۔

۱۶۔ ریاض ترنم ''یہ تنگ زمین''، موڈرن پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۹۸۔

۱۷۔ ریاض ترنم ''یمبر زل''، نرالی دنیا پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۴۔

۱۸۔ ریاض ترنم ''مورتی''، نرالی دنیا پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۴۔

۱۹۔ ریاض ترنم ''میرا رخت سفر'' ترنم ریاض، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۸۔

۲۰۔ سالک سلیم ''**جموں وکشمیر کے منتخب اُردو افسانے**'' (پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک) میزان پبلی کیشنز، ۲۰۱۲۔

۲۱۔ سعید حمیرہ ''اُردو ناولوں میں نسائی حسیت''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۰۹۔

۲۲۔ شاہ نور ''جموں کشمیر کے اُردو افسانہ نگار''، میزان پبلی کیشنز، ۲۰۰۸

۲۳۔ شمس محمد شہزاد ''عورت اور سماج''، تخلیق کار پبلشرز دہلی، ۲۰۰۸

۲۴۔ صدف مشتاق ''اُردو کی خواتین فکشن نگار''، ساہتیہ اکادمی، ۲۰۱۴۔

۲۵۔ صدیقی ریاض ''فیمنسٹ ادب کا مطالعہ''، ماہنامہ 'شاعر' ممبی،

۲۶۔ صغیر ڈاکٹر احمد ''اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی ۲۰۰۹۔

۲۷۔ عطیق پروفیسر ''تانیثیت ایک سیاقی مطالعہ''، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۲۸۔ عزیز طلعت ''تعلیمی نفسیات''، قومی کونسل برائے فروغ اُردو، ۲۰۱۳

۲۹۔ علی لیاقت ''جموں و کشمیر اُردو ادب (۲۰۰۰ سے ۲۰۱۳)''، ایم۔آر پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۱۷۔

۳۰۔ فرزانہ نیلم ''اُردو افسانے کے فروغ میں خواتین''، دہلی پبلکیشنز،۔۔۔۔۔۔

۳۱۔ فرزانہ نسیم ''اُردو کی اہم خواتین ناول نگار''، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۱۹۹۲۔

۳۲۔ قاسمی ابوالکلام ''اُردو فکشن کے مضمرات''، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ ۲۰۱۶۔

۳۳۔ کبیر فہمیدہ ''اُردو ناول میں عورت کا تصور (نذیر احمد سے پریم چند تک)''، مکتبہ جامعہ لمیڈ یڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۰۱۲۔

۳۴۔ مہدی صغراء ''ہندوستان میں عورت کی حیثیت''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵۔

۳۵۔ نارنگ گوپی چند ''اُردو افسانہ روایت اور مسائل''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی۔۔۔

۳۶۔ نبی شہناز ''فیمنزم (جرمنی میں) مشمولہ''

۳۶۔ نبی شہناز ''فیمیزم (تاریخ وتنقید)، رہروان ادب پبلی کیشنز کولکاتا ۲۰۱۲۔

۳۷۔ ناہید کشور ''عورت خواب اور خاک کے درمیان''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵۔

۳۸۔ وانی ڈاکٹر مشتاق احمد **''اُردو ادب میں تانیثیت''** ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۲۰۱۳

۳۹۔ ہارڈنگ ایم استھر ''عورتوں کی نفسیات''، بیسویں پلیکیشنز،

۴۰۔ ہمارا ادب: جموں و کشمیر معاصر نسائی ادب نمبر'' کلچرا کیڈمی جموں و کشمیر، ۱۶۔۲۰۱۵۔

۱۴؎ یوسفی سعد حسن خان ''مقدمہ ابن خلدون، مترجمہ، بحوالہ جدید اُردو تنقید اصول و نظریات، مصنف شارب ردیلوی۔

رسالہ جات

۱۔ ''اُردو دنیا'' نئی دہلی، جلد ۱۸، شمارہ ۳ مارچ ۲۰۱۶۔

۲۔ مشمولہ رسالہ ''بازیافت ۲۰۰۹''، شعبہ اُردو، شمارہ ۴۵، کشمیر یونیورسٹی۔

۳۔ مشمولہ ماہنامہ ''شاعر'' ممبی، ۲۰۰۴، شمارہ ۴۰۔

۴۔ ایوان اُردو نئی دہلی جلد ۲۵، شمارہ ۷، نومبر ۲۰۰۹۔

۵۔ ماہنامہ اُردو دنیا نئی دہلی جلد ۱۸، شمارہ ۳، مارچ ۲۰۱۶۔

٦۔ ماہنامہ شاعر ممبی، اُردو دنیا نئی دہلی، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۰۴

۷۔ شعر و حکمت دسمبر ۲۰۰۷۔

☆☆☆